دوسرا رُخ
ڈاکٹر سید سعید نقوی

دوسرا رُخ

ڈاکٹر سید سعید نقوی

Dosra Rukh
Dr. Syed Saeed Naqvi

پہلی اشاعت: ۲۰۱۱ء
کمپوزنگ: احمد گرافکس، کراچی
طباعت: اے جی پرنٹرز، کراچی

بی۔ ۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی۔
info@scheherzade.com

انتساب

اپنے پیارے والدین کے نام

فہرست

رضیہ فصیح احمد

دوسرا رخ

سیّد سعید نقوی کے افسانوں کا مجموعہ 'دوسرا رخ' مجھے اس شرط کے ساتھ ملا کہ میں اس پر کچھ لکھ دوں۔ سیّد صاحب کو خوب معلوم ہے کہ میں نہ مبصر نہ محقق۔ ان کی طرح کی ایک افسانہ نگار ہوں یعنی ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، میں کچھ پہلے سوار ہوئی اور وہ بعد میں۔ میرے افسانوں کے پہلے مجموعے پر محمد کاظم صاحب نے برسوں پہلے بہت اچھا تبصرہ لکھا اس کے بعد وزیر آغا، اسلوب انصاری، حنیف فوق اور دوسرے لوگ میرے ناولوں پر لکھتے رہے سو ایک دن آئے گا کہ ایسے ہی لکھنے والے سعید نقوی کے افسانوں پر بھی لکھیں گے میں تو اپنے تجربے کی بنا پر چند باتیں کہہ سکتی ہوں۔ یعنی اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ لکھنے کے لئے کن تین چیزوں کی ضرورت ہے تو میں کہوں گی، خلوص، خلوص اور خلوص۔

خلوص اپنی ذات سے، خلوص اپنے کام سے اور خلوص اپنے موضوع سے۔ خلوص کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اپنے موضوع کی تعریف میں جٹ جائیں بلکہ جو کچھ بھی لکھیں اس میں آپ کا یقین شامل ہو۔ یہ یقین وہ جزو ہے جو تحریر سے متاثر کرواتا ہے۔ کسی بڑے مصنف کی کسی اچھی اور مشہور تحریر کے بارے میں سوچیے اگر اس میں خلوص شامل ہے تو اس میں وہ روح

موجود ہے جو اس تحریر کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

ڈاکٹر سیّد سعید نقوی اپنی ڈاکٹری کی گوناگوں مصروفیات کے باوجود لکھ رہے ہیں وہ اس خلوص کے مارے ہوئے ہیں۔ میں نے ان کی کتابوں کی لائبریری دیکھی ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ پڑھنا اور لکھنا اس بیچارے شخص کی مجبوری ہے جس طرح ہر اچھے لکھنے والے کی ہوتی ہے۔ لکھنے والے کی مجبوری کو انھوں نے اپنے افسانے میں ایک فقرے میں اس طرح سمویا ہے کہ ''اب کیا شعر و ادب کی تخلیق بھی ذریعہ معاش بنے گی افسانوں سے آپ گرہستی تو کیا کاغذ اور قلم کی قیمت بھی نہیں نکال سکتے'۔ تحریر میں جا بجا ڈارون، غالب، اقبال اور فیض کے کلام سے بھی فیض اٹھاتے جاتے ہیں مگر اس طرح کہ جو جانتا ہے وہی سمجھ سکتا ہے۔ کتاب کا نام'' دوسرا رخ'' ہے اور تقریباً ہر افسانے میں یہ دوسرا رخ موجود ہے۔ افسانوں میں یہ متضاد کیفیتیں بھی ان کی تحریر کا خاصا ہیں۔ دوسرا رخ افسانے میں دوست خواتین کی دو رخی ہے تو گرگٹ میں مولوی صاحب کا گھٹنوں کے بل گھسنا۔ صبح کا بھولا میں روز جعلی دوائیاں بیچنا اور پابندی سے نماز پڑھنا اور نوکر کا یہ کہنا کہ روز جعلی دوائیاں بیچتے ہیں تو نماز ہوجاتی ہے۔ مولوی میں کرسچن لڑکی کے ہاتھ میں آیات دیکھ کر جنھیں وہ اپنی بیگم کو دینا چاہتی ہے کہ وہ اسے کہیں اچھی جگہ رکھ دیں اس کو ناموسِ رسالتؐ کے الزام تک پہنچا دینا۔ طائرِ لاہوتی کے بندر کا ذہن دو حصوں میں بٹ چکا تھا ایک طرف محکومی تھی آسانی تھی، پکا پکایا میسر تھا دوسری طرف آزادی تھی، خطرات تھے۔ ان دو راہوں میں بٹ جانے والے بندر کی لاش دوسرے بندروں کے لیے عبرت کا مقام بن جاتی ہے کہ بھاگو گے تو یہ انجام ہوگا۔

آٹو ورکشاپ ان کا افسانہ اس سے مختلف مزاج کا ابتدا میں مزاحیہ جملوں سے بھرپور افسانہ ہے جو آخر میں المیہ ہوجاتا ہے۔ اس کے بعض جملے ایسے ہیں کہ مرحوم صہبا لکھنوی پڑھ لیتے تو ان سے مزاح لکھنے کی فرمائش ضرور کرتے۔ مثلاً آٹو ورکشاپ میں لکھتے ہیں۔'' وہ اپنی مذکورہ اور غیر مذکورہ کی ہیئیوں کو بیان کر کے مفت مشورہ پاتے تھے۔ ایسے مسائل جن میں خفت کا اندیشہ ہو وہ کسی دوست یا جاننے والے کے نام سے بیان کرتے''۔ یا'' دائی کی طرح کار کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر معاملے کی نوعیت بھانپ لیتے۔''

''وہ مرسی ڈیز جس کا ظاہر اچھا ہو اور کارکردگی صفر ہو تو سمجھو خطرے کی گھنٹی بج رہی ہے۔
نہیں جناب ایسی گاڑی بالکل نہ لیں''۔ یہ حکمت جانتے ہوئے بھی چودھری صاحب دھوکا کھا
جاتے ہیں۔ کیونکہ مرسی ڈیز ہے ہی ایسی چیز۔
تعلقِ خاطر کا یہ جملہ دیکھیے'' ایسی جگہ پر آدمی یا تو اپنی زبان سے دانش ور لگے ورنہ کم از
کم اپنے لباس سے''

یہ ڈاکٹر صاحب اتنے ذہین وفطین ہیں کہ نظریۂ ضرورت یا اپنی فطری افتاد کے تحت جب
چاہتے ہیں بیانیہ کو علامت میں ڈھال دیتے ہیں، مورنی سے رقص کرواتے ہیں اور دھاری دھار
گھوڑا تخلیق کر لیتے ہیں، کار چلاتے ہوئے جن ان کی کار پر آبیٹھتا ہے اور ہم برا نہیں مانتے کہ
ہم ان کا عندیہ جان لیتے ہیں کہ یہ باتوں باتوں میں پڑھنے والوں کو سبق پڑھانے والے ہیں۔
یہ اپنے علاج معالجے میں بھی ایسی ہی تکنیک اختیار کرتے ہوں گے تو جانے کیا گل
کھلاتے ہوں گے۔ مگر میں یہ جانتی ہوں کہ ذہین آدمی کے تجربے بھی کامیاب ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری (ستارۂ امتیاز)
ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ
مدیر اعلیٰ، نگار پاکستان

سابق پروفیسر، وچیئرمین شعبۂ اردو، کراچی یونیورسٹی
چیف ایڈیٹر و سیکریٹری، اردو ڈکشنری بورڈ، کراچی
وزارت تعلیم، حکومت پاکستان
ممبر، سندھ پبلک سروس کمیشن
صدر، اردو ڈکشنری بورڈ، کراچی

Former Professor & Chairman
Department of Urdu, University of Karachi
Chief Editor & Secretary UDB
Ministry of Education, Government of Pakistan
Member, Sindh Public Service Commission
President: Urdu Dictionary Board Karachi
Ministry of Education, Government of Pakistan

کچھ ڈاکٹر سید سعید نقوی صاحب کے بارے میں

ڈاکٹر سید سعید نقوی صاحب غیر معمولی تخلیقی ذہن کے مالک ہیں، ہر دل عزیز صاحب قلم کار ہیں اور اردو کے نامور افسانہ نگار ہیں لیکن افسانہ، اُن کے یہاں محض دل بہلانے والی قصہ خوانی نہیں ہے بلکہ زندگی کی جیتی جاگتی حقیقتوں کا انکشاف ہے۔

اُن کے افسانوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اُن کے ہر افسانے کی پشت پر کوئی نہ کوئی حقیقت موجود ہوتی ہے اور یہی قصہ نما حقیقت اُن کی تحریروں کو آخر آخر افسانہ بنا دیتی ہے ایسا افسانہ جو مروجہ افسانے کی ڈگر سے الگ ہوتا ہے اور سخت سے سخت تنقیدی معیار پر بھی افسانہ بنائے رکھتا ہے۔

ڈاکٹر سید سعید نقوی کی تحریروں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ مغرب میں مشرق کے ثقافتی ترجمان ہیں، اُن کا ذہن مطالعے کی وسعت بنیاد پر مغربی سہی لیکن قلب و روح کی سطح پر خالص مشرقی ہے ایک ایک لفظ سے سراغ لگتا ہے کہ ان کا دل و دماغ ایشیائی خالص تہذیبی اقدار کا نمائندہ ہے۔ ہرچند کہ وہ پاکستان سے ہزاروں میل دور امریکہ میں مقیم ہیں لیکن اُن کی جذباتی ومحسوساتی دنیا یکسر مشرقی تمدن سے وابستہ ہے اور وہ مشرقی تمدن کو مرکز بنا کر اپنی کہانیوں کا آغاز کرتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ اُن کے پہلے مجموعے کی طرح اُن کا زیرِ نظر افسانوی مجموعہ بھی مقبول ہوگا اور عام و خاص دونوں ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

افسوس کہ میں علالت کے سبب اس وقت تفصیل سے لکھنے کی سکت نہیں رکھتا ورنہ دل کھول کر لکھتا، لطف اندوز ہوتا اور لطف اندوزی میں قاری کو بھی برابر شریک رکھتا۔ زندگی رہی تو بعد کو وضاحت سے لکھوں گا اور ڈاکٹر سعید نقوی کے تخلیقی ذہن کی داد دوں گا۔

فرمان فتح پوری

Mailing Address C-28, 13/D, Gulshan-e-Iqbal, Karachi-75300, Pakistan Phones Res. 4980440 Off. 4985867

عصری زندگی کی تنقیدی تصویر کشی

ڈاکٹر سید سعید نقوی کے افسانے

آج کے ممتاز امریکی فکشن نگار اور نقاد رچرڈ روسو (Richard Russo) نے بغیر حوالہ دیے کسی افسانے کے دو کرداروں، باپ اور بیٹے، کا ذکر کیا ہے۔ دونوں افسانہ نگار ہوتے ہیں۔ باپ جس نے بڑی عمر میں افسانے لکھنے شروع کیے، افسانہ نگاری کو خواب دیکھنے اور دکھانے کے مماثل گردانتا ہے جبکہ بیٹے کے خیال میں افسانہ شہد کی مکھیوں سے بھرا مرتبان ہے۔ ڈھکن کھلا اور شہد کی مکھیاں باہر۔ رچرڈ روسو شہد کی مکھیوں کی ڈنکوں کی سوزش، حدت اور سوجن کا ذکر کرتے ہوئے اس خصوصیت پر زور دیتا ہے کہ ایک اچھا افسانہ، قاری کو اچانک ڈنک مار کر حیران کر دیتا ہے اور ڈنک کی چبھن میں ایک نوع کی تیکھی لذت سے آشنا کر دیتا ہے۔

اگرچہ ڈاکٹر سید سعید نقوی نے افسانہ نگاری کا آغاز خاصی پختہ عمر میں، تاخیر سے کیا لیکن خواب دیکھنے اور دکھانے کی جگہ شہد کی مکھیوں سے بھرے ہوئے مرتبانوں کے ڈھکن کھولنے کو ترجیح دی۔ ان کا افسانہ زندگی کی تنقیدی تصویر کشی ہے۔ یہ تنقید طنز سے کبھی آگے نہیں بڑھتی۔ تجاوز کر کے سٹائر (Satire) کا روپ نہیں دھارتی۔ نیش سوزن رہتی ہے نیش عقرب نہیں بنتی۔

میں نے جب ان سے سوال کیا کہ وہ کردار اساسی افسانے لکھنے کو ترجیح دیتے ہیں یا پلاٹ (وقوعہ) اساسی، تو انھوں نے جواب دیا کہ وہ موضوعاتی افسانے لکھتے ہیں لیکن شگفتہ انداز میں۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعے کا نام' نامہ بر' اس حقیقت کا ابلاغ کرتا ہے کہ افسانہ نگار قاری تک کوئی پیغام پہنچانا چاہتا ہے۔ ان کے دوسرے (زیرِ نظر) مجموعے کا نام 'دوسرا رخ' قاری کی توجہ ہمارے اطراف پھیلی ہوئی معاشرتی زندگی کی جانب مبذول کرتے ہوئے مطالبہ کرتا ہے کہ تصویر کے ایک رخ کو دیکھنے پر اکتفا نہ کریں، دوسرا رخ بھی دیکھیں۔ کتاب دوسرا رخ کے آغاز میں دو ماسک مکھوٹے دکھائے گئے ہیں۔ آگے کا مکھوٹا منہ پھاڑ کر ہنس رہا ہے تو عقبی مکھوٹا حلق پھاڑ کر رو رہا ہے۔ دونوں مل کر انسانی زندگی کے دو متضاد رخوں کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ زندگی خوشی اور غم کا سادہ آمیزہ نہیں بلکہ کیمیائی مرکب ہے۔ جس طرح ہائیڈروجن اور آکسیجن کا کیمیائی مرکب پانی ہے عین اسی طرح خوشی اور غم کا کیمیائی مرکب انسانی زندگی ہے۔

ڈاکٹر سید سعید نقوی کے بیانیے اور زبان پر بات کرنا اس سبب سے ضروری ہے کہ انھیں افسانے کے بہانے زندگی اور اس کے متنوع عوامل اور انسانی معاشروں (مشرقی.مغربی.ترقی یافتہ.ترقی پذیر اور پست) پر ناقدانہ اور طنزیہ انداز میں رائے زنی کا شوق نہیں ۔۔ ہوکا۔۔ ہے۔ اسی شوق اور ہوکے کے زور پر وہ اپنے افسانے کا شہد کی مکھیوں بھرا مرتبان کھولتے ہیں۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے وہ 'غبارِ خاطر' کے مولانا ابوالکلام ہیں اور نہ ہی 'آبِ حیات' کے محمد حسین آزاد۔ ان کی زبان کرخنداروں کی تو نہیں البتہ پاکستان کے بڑے تجارتی شہر کراچی کی اردو ہے جس پر لیاری کا تڑکا بھی لگا ہے۔ یوں بھی ڈاکٹروں کی زبان کا کیا ٹھکانہ! ان کے افسانوں کی زبان سے یہ ضرور عیاں ہوتا ہے کہ وہ رواں، فصیح اور اچھی سے اچھی اردو لکھنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔

'جوانی سب پر آتی ہے مگر بعض پر ایسی کہ نظر جما کر دیکھ لو تو ایمان ہاتھ سے جاتا رہے۔۔'

'عبدالحق سے اسے بہت الجھا دینے والے سگنل ملتے۔۔۔۔تجھے یہ ڈر نہیں یہ جسم جہنم میں جلایا جائے گا' عبدالحق نے جہنم میں جلنے والے اس جسم کا ایسے بغور معاینہ کیا جیسے جلنے سے پہلے آخری دفعہ دیکھ رہے ہوں (مولوی عبدالحق)

'مرنے کا شوق ہے تو ٹرین کے آگے کود و کہ نہ تو وہ وقت پر آتی ہے اور نہ وقت پر جاتی ہے اور نہ ہی وقت پر رک پاتی ہے۔۔۔۔غبارہ پھولتا رہے اور پھر اچانک ایک سوئی کی نوک لگے اور بوم۔۔۔۔بغیر محنت کے پھل سے کم ہی لوگ پرہیز کرتے ہیں۔۔۔خوشی اپنے وقت سے آتی ہے ہمارا کیلنڈر نہیں دیکھتی۔۔۔تاریخ کے جو باب تاریک ہوتے ہیں انھیں یا تو ہم بند کر دیتے ہیں یا ان میں spin پیدا کر دیتے ہیں۔۔۔ڈاکٹر کیا نابینا خواب دیکھ سکتے ہیں۔ (سود و زیاں)

'رات کے سناٹے کی اپنی ایک آواز ہے خامشی سے بالکل علیحدہ۔۔۔باورچی خانے سے دو فرنچ نسل کے دروازے باہر باغیچے میں کھلتے تھے۔ یوں تو یہ دروازے بہت کارآمد ہوتے ہیں 'دونوں پاٹوپاٹ کھل جاتے ہیں۔ بڑے اسکرین کے ٹی وی سے لے کر صاحبِ خانہ کی میت تک گزار لیجیے۔۔۔نوجوان نے چاقو اپنے ہاتھ میں ذرا سامنے کی رخ پر رکھا کہ اس کا فاصلہ میری ہمت سے بمشکل ایک فٹ رہا ہوگا۔۔۔بس اتنا دے دیجیے کہ پھر چوری کا کھٹکا نہ رہے۔ مرزا تو رہزن کو دعا تک دیتے تھے۔۔۔غریب جرنلسٹ کو عموماً صلیب انعام میں ملتی ہے۔۔۔بے محل شعر پڑھنے والوں کو میں ویسے بھی قابلِ دست اندازیٔ پولیس سمجھتی ہوں۔۔(چور)

'سوال کا جواب سوال سے دیجیے، آزمودہ نسخہ ہے۔۔میرے پاس قابلِ فروخت دلائل کی کمی تھی'۔۔۔(نگینہ)

'اور یہی خود بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ہوا' منظر تھا کچھ اور' انھیں کچھ اور نظر آتا رہا'۔۔۔ (چشمِ حیران)

'بہت سے دیسی گوری خواتین سے ۱۸۵۷ء کی توہین کا بدلہ لینے پر آمادہ رہتے ہیں'۔۔ (آٹو ورکشاپ)

'منہ تو چارے کی بالٹی میں تھا مگر آنکھیں ماتھے پر دھری تھیں'۔۔(بے لگام)

'کامیابی اپنا ثبوت خود ہوتی ہے'۔۔۔(پلے بوائے)

'سارا شہر ایک اجتماعی نیند سو رہا ہے'۔۔۔(صبح کا بھولا)

'کتنی خواہشیں برقع اوڑھے پھر رہی ہیں'۔۔۔(شمشان گھاٹ)

'قیمت چیز کی نہیں بلکہ اس کے حوالے اور وابستگی کی ہے'۔۔۔(تعلقِ خاطر)

'کچھ خود ساختہ سماجی کارکنوں کا کہنا تھا کہ برائیاں کم نہیں ہوئیں اندرون ہو گئی ہیں'۔۔۔(گرگٹ)

مندرجہ بالا اقتباسات کو پڑھنے کے بعد آپ نے محسوس کر لیا ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کے بعض فقرے انگریزی سے مستعار ہیں

میرے پاس قابلِ فروخت دلائل کی کمی تھی'

'کامیابی اپنا ثبوت خود ہوتی ہے'

'فرنچ نسل کے دروازے'

ان کے کچھ فقرے کہاوتوں اور ضرب المثل کا مزاج رکھتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کو حکمت و دانش کے جواہر پارے کہا جا سکتا ہے؛

'بغیر محنت کے پھل سے کم ہی لوگ پرہیز کرتے ہیں'

'گفتگو میں پہل کرنے سے اکثر کمزور پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں'

'خوشی اپنے وقت سے آتی ہے، ہمارا کیلنڈر نہیں دیکھتی'

'تاریخ کے جو باب تاریک ہوتے ہیں، انھیں یا تو ہم بند کر دیتے ہیں، یا ان میں spin پیدا کر دیتے ہیں'

'کیا نابینا خواب دیکھ سکتے ہیں'

'یہ بتائیے پکڑے گا کون؟ پکڑنے والے کے آگے پیٹ نہیں لگا گیا'

'سوال کا جواب سوال سے دیجیے'

ڈاکٹر صاحب نے کہیں کہیں اپنے بیانیے کو شعر و ادب کے حوالوں سے پُرلطف بنا دیا ہے؛

'بہت سے دیسی گوری خواتین سے ۱۸۵۷ء کی توہین کا بدلہ لینے پر آمادہ رہتے ہیں (ن۔م۔راشد کی نظم کا حوالہ)

'بس اتنا دے دیجیے کہ پھر چوری کا کھٹکا نہ رہے۔ مرزا تو رہزن کو دعا تک دیتے تھے

(مرزا غالب کے مشہور شعر کا حوالہ؛ رہا کھٹکا نہ چوری کا۔۔دعا دیتا ہوں رہزن کو)

افسانے کے تشکیلی عناصر میں پلاٹ اور کردار کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بعض افسانے بڑی حد تک کردار اساسی ہیں جیسے گرگٹ' پلے بوائے' آٹو ورکشاپ' شمشان گھاٹ' نگینہ اور صبح کا بھولا۔ ان میں آخر الذکر تین افسانوں میں کرداروں کی کشمکش یا دیگر معاملات الجھا دیے گئے ہیں۔ یوں بھی کردار اساسی افسانے سطحی' سپاٹ اور تہہ داری سے محروم ہوں تو خاکوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے افسانوں میں کردار گوشت پوست سے تشکیل پاتے ہیں کارڈ بورڈ کردار نہیں ہوتے، نہ ہی سطحی خارجی، یک رخے ہوتے ہیں۔ 'گرگٹ' کا مولوی مشتاق گرگٹ کی مانند رنگ بدلنے والا آدمی ہے۔ دنیا' مشرق ہو یا مغرب کسی زمانے میں مولوی مشتاق جیسے لوگوں سے خالی نہیں رہی اور نہ رہے گی۔ ایسے لوگوں کے لیے کہا گیا ہے' چوں بہ خلوت می روند آن کارِ دیگر می کنند'۔ اس ٹائپ کردار کو افسانہ نگار نے زندہ 'فلش اینڈ بلڈ' کردار میں تبدیل کر کے اپنی تکنیکی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ مولوی مشتاق کے مقابلے میں 'آٹو ورکشاپ' کا چوہدری افتخار ٹائپ کردار کم 'راؤنڈڈ' کردار زیادہ ہے۔ اس میں آٹو ورکشاپ مکینک کی عادات' حرکات وسکنات کے علاوہ دیسی آدمی کی کمزوریاں بدرجہء اتم موجود ہیں اور یہی اس کو الم ناک موت سے دو چار کر دیتی ہیں۔' پلے بوائے' کا فراز اپنی اصلی شخصیت سے قطعی مختلف اور متضاد شخصیت کا نقاب (ماسک) اوڑھے ہوئے ہے۔ شمشان گھاٹ کی' میں' ایک پیچیدہ کردار ہے جو کرداروں کی دنیا میں اپنی انوکھی انفرادیت تسلیم کرواتا ہے۔ اس' میں' کا اشتراک یا تصادم جن دو کرداروں سے دکھایا گیا ہے وہ پیشے کے لحاظ سے محترم ہیں۔ ایک استاد ہے تو دوسرا ڈاکٹر۔' میں' ان دونوں کی بیک وقت ہدف بھی ہے اور شکاری بھی۔' میں' ان دونوں کو بے نقاب بھی کرتی ہے اور ان دونوں سے بے نقاب بھی ہوتی ہے۔ حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ میں ان دونوں کی تکمیل کرتی ہے جب کہ ان دونوں کو اس کی با اعتبارِ پیشہ اصلاح اور تکمیل کرنی چاہیے تھی۔' نگینہ' اور' صبح کا بھولا' کردار کے مطالعہ پر مشتمل ہیں۔

جہاں تک کرداروں کے مطالعے کا تعلق ہے ڈاکٹر صاحب کے سبھی افسانے اس دائرے

میں آتے ہیں۔ ان میں وہ افسانے بھی شامل ہیں جن کے کردار جانور ہیں، جیسے افسانہ 'بے لگام' کے گھوڑے یا 'طائرِ لاہوتی' کے بندر۔ 'بے لگام' پڑھنے کے دوران آپ اکثر و بیشتر گھوڑوں کی حیوانیت کو آدمیوں کی بشریت کے مقابل ہی نہیں بلکہ متبادل سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ خیال رکھیے کہیں اس افسانے کے زیرِ اثر آپ کو ہر آدمی کے اندر اک گھوڑا ہنہناتا نظر آنے لگے جس طرح سندھ کے وتایو فقیر کو آدمیوں کے اندر جانور دکھائی دینے لگے تھے اور وہ ان سے محفوظ رہنے کے لیے ایک پہاڑی پر چڑھ گیا تھا۔

امریکہ میں ابراہام لنکن کے جرأت مندانہ اقدامات کے طفیل غلامی کا خاتمہ ہوا تو ساتھ ہی اس ملک میں بسنے والے کالوں پر گوروں کی برابری کے دریچے وا ہوئے۔ لیکن گوروں کے بطون میں سمائے ہوئے رنگ و نسل کی اساس پر قائم و دائم 'گورا امتیاز' (White Superiority) کا بیج و بن سے اکھاڑا جانا آسان ثابت نہیں ہوا۔ 'بے لگام' یوں گورا امتیاز کے موضوع پر ایک شاندار افسانے کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اس افسانے کی کئی جہتیں ہیں۔ یہ ایک کامیاب موضوعاتی افسانہ (Thematic Story) ہے۔ مطالعہ کردار کی ایک اور دلآویز صورت ہے۔ یہ پلاٹ اساسی افسانہ ہے۔ اس میں ایک بنیادی پلاٹ کے علاوہ، ایک سے زائد ثانوی پلاٹ دریافت کیے جا سکتے ہیں۔ بنیادی کہانی میں، شمالی فلوریڈا میں، جارج کے چھوٹے سے رینچ یا اصطبل میں ایک سفید گھوڑی کے علاوہ تین گھوڑے بندھے تھے۔ درجہ بندی کے مطابق ان میں ایک نمبر سفید رنگ کا نوجوان اور تیز و طرار گھوڑا، بے حد مغرور ہونے کے ساتھ 'گورا امتیاز' کا حامل تھا۔ اس کے برخلاف سفید گھوڑا نمبر دو منکسر المزاج، لبرل، انصاف پسند اور نرم خو تھا۔ تیسرا گھوڑا جو کسی نہ کسی طرح ان دو سے ہل مل گیا تھا، کالا تھا۔ وہ مرنجاں و مرنج طبیعت کا تھا۔ یوں بھی وہ اپنے سیاہ رنگ کی احساسِ کمتری کے بوجھ تلے دبا دبا سا رہتا تھا۔ ان تین گھوڑوں کے درمیان ایک سفید گھوڑی نسائیت کی رول ماڈل تھی۔ وہ اپنی نسائیت کو کسی ایک گھوڑے یا رنگ و نسل کے امتیاز سے ملوث نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے انفرادی فیصلے خود کرتی اور ان کو عملی جامہ پہنانے میں تامل کرنے کی روادار نہیں تھی۔ کہانی کے آغاز کے مرحلے پر ان چاروں میں امریکی 'ملٹی کلچرل' آپسی برداشت، رواداری، لین دین (Give and Take) جو کچھ بھی کہا جائے،

رسان سے جاری تھا، کہ پانچویں گھوڑے کی اصطبل میں آمد (انٹری) ہوئی اور توازن بگڑ گیا۔
اس افسانے کا پلاٹ دو بڑے تکونوں پر مشتمل ہے۔ اہم ترین تکون میں اصطبل کے مالک جارج کی جوان بیٹی لوسی مرکز اور محور ہے، جبکہ ایک جانب سفید گھوڑا نمبر ایک جو افسانے کا ولن ہیرو ہے، دوسری جانب دھاریدار گھوڑا، نو وارد و اجنبی لیکن لوسی کی توجہ کا نیا ساجھے دار یا حقدار۔ یہ لوسی وجہ نزاع (Bone of Contention) اور سفید گھورے نمبر ایک کی اموات کے المیے پر ختم ہونے والا تکون ہے۔ دوسرا سفید گھوڑے نمبر ایک، دھاریدار گھوڑے اور سفید گھوڑی پر مشتمل ہے۔ اس تکون میں دھاریدار گھوڑا ہیرو، سفید گھوڑی ہیروئن اور سفید گھوڑا نمبر ایک ولن کے روپ میں نمودار ہوتے ہیں ان تکونوں کے علاوہ پلاٹ کی ایک اور شکل سامنے آتی ہے جس میں دھاریدار مہاجر (Immigrant) ہے۔ سفید گھوڑا نمبر ایک، سفید گھوڑا نمبر دو، اسپِ سیاہ اور سفید گھوڑی فرزندان و دخترِ زمین کا کردار ادا کرتے ہیں۔ اس پلاٹ میں سفید نمبر ایک متعصب، رنگ و نسل، سازشی، شر پسند اور دہشت گرد کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ ہند و پاک کے دیہاتی رومانس کی رو پر بھی ایک پلاٹ ابھرتا ہے جس کے مطابق دھاری دار پردیسی بامی، سفید گھوڑی گاؤں کی گوری اور سفید گھوڑا نمبر ایک رقیب روسفید ہے۔

عالمِ حیوانات سے متعلق دوسرا افسانہ موضوعی ہے جس کا مرکزی خیال بظاہر علامہ اقبال کے مندرجہ شعر سے ماخوذ ہے:

اے طائرِ لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

فرق صرف یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے افسانے میں کرداروں کے طور پر طائروں کی جگہ بندروں کو لیا ہے۔ اس افسانے میں ایک جانب غلامی کی زندگی کی تن آسانیاں تو دوسری جانب آزادی کی زندگی کی صعوبتیں ایک دوسرے کے مقابل دکھائی گئی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے افسانوں کے موضوعات وسیع، کثیر الجہات اور انتہائی پیچیدہ اصلی زندگی سے لیتے ہیں، اس سبب سے ان کا پلاٹ ان کے قلم کی گرفت سے پھسل پھسل جاتا ہے اور ساتھ ہی یک موضوعیت کی ڈور بھی ایک سے زائد موضوعات کے جال میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر 'طائرِ

لاہوتی' میں غلامی کے حصار سے باہر نکلے ہوئے بندر کو پہاڑی والے بندروں کی بارشِ سنگ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ زخمی ہو کر پسپا ہوتا ہے اور واپسی کے سفر کے دوران مر جاتا ہے۔ یہ پسپائی اور موت افسانے کو اصل موضوع، غلامی اور آزادی سے دور کر کے بندروں میں جتھے کی صورت زندگی گزارنے کی جبلت سے الجھا دیتی ہے۔ اس جبلت کے زیرِ اثر پہاڑی والے بندر اپنے جتھے میں کسی اجنبی بندر کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ یہ جبلت بندروں تک محدود نہیں تقریباً سارے جانداروں بہ شمول حضرت انسان، کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔

ڈاکٹر سید سعید نقوی نے اپنے افسانوں میں نت نئے تکنیکی تجربوں کو راہ دی ہے، اور طرح طرح کے ڈیوائسس (Devices) سے کام لیا ہے۔ 'چور' میں آئینہ، 'چشمِ حیراں' میں فلم بین اور 'سود و زیاں' میں جن کی مثال دی جا سکتی ہے۔ ان کی یہ کوششیں لائقِ تحسین ہیں۔ آرٹ کے ساتھ کرافٹ بھی جدت طرازی اور تازہ کاری کا طالب رہتا ہے۔

قارئین میں بہت کم کو یہ ادراک ہوتا ہوگا کہ افسانہ نگار اپنے افسانے کو کاغذ پر لانے کے دوران کیسی کیسی تکنیکی دشواریوں سے عہدہ برا ہوتا ہے۔ اس غریب کو اپنے ہر افسانے کے موضوع ، مرکزی خیال کے مطابق کہانی گھڑنی یا اپنے اطراف پھیلی ہوئی زندگی سے مستعار لینی پڑتی ہوگی۔ کہانی کی اساس پر وقوعہ یا واقعات کا تعین کرنا پڑتا ہوگا۔ جیتے جاگتے لوگوں جیسے کردار تخلیق کرنے پڑتے ہوں گے۔ ان کو زندگی گزارنے کے لیے ایک چھوٹی یا بڑی دنیا (Locate) دینی پڑتی ہوگی اور پھر ان کی زندگیوں کو مناسب اتار چڑھاؤ، مناسب منظر نگاری اور مکالموں کی مدد سے اصل زندگی کا تاثر ودیعت کرنا پڑتا ہوگا کہ قاری اس پیشکش کو حقیقی تسلیم کر لے اور سسپینشن آف ڈس بیلیف (Suspenson of Disbelief) کا جادو قاری کو مسحور کر لے۔

میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ چند ایک سینئیر اہلِ نقد و نظر نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ علامتی افسانے کی رخصتی یا نیم رخصتی کے بعد افسانہ لکھنا آسان ہو گیا ہے۔ یہ محض ایک قیاس ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ آج افسانہ لکھنا پہلے سے زیادہ مشکل ہے۔ افسانہ نگار اگر اپنے مشاہدۂ حیات کا نچوڑ قاری تک پہنچانا چاہے تو علامت، رمز، ایمائیت، تجسیم، تجرید اور ابہام اس کی اعانت کرتے ہیں۔ ان سے گریزاں افسانہ اتنا زیادہ شفاف (Transparent) ہوتا ہے کہ

افسانہ نگار کو ایسا کرنے کے لیے افسانے کی افسانویت کو بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ قدرت کا تخلیقی عمل (تخلیق کائنات سے لے کر رحمِ مادر میں جنین کی پرورش تک) نیم روشن، نیم تاریک فضا میں تکمیل پاتا ہے۔ علامتی، رمزیتی، تجریدی، نیم تجریدی اسالیب سے اکہانی (No Story) کے مرحلے تک افسانہ نگار کو ایسی فضا دستیاب رہتی ہے۔ آج جو اچھا افسانہ لکھا جا رہا ہے وہ نہ تو آسان ہے اور نہ ہی بے بضاعت۔ آج بھی معیاری افسانے تخلیق ہو رہے ہیں۔ اگر ہمارے نقاد نئے افسانوں کو پڑھنے میں عدم دلچسپی کا مظاہرہ کر رہے ہیں تو اس میں افسانے کی صنف یا آج کے افسانہ نگاروں کی کوتاہیوں کا دخل نہیں ہے۔ آج بھی افسانہ اپنے اختصار کے باوجود عصری زندگی کی تصویر کشی کو حال سے ماضی میں، مستقبل میں دور تک پہنچا کر اس کو آفاقیت کی وسعتوں، بلندیوں اور گہرائیوں سے روشناس کر رہا ہے۔ میں نے افسانوں کے معاملے میں بڑے دکھ اور کرب کے ساتھ اس تلخ اور اندوہ ناک حقیقت کا مشاہدہ کیا ہے کہ آج کے اکابر نقاد افسانوں کی کتابوں کا مطالعہ تو رہا ایک طرف، ورق گردانی کے بھی روادار نہیں۔ آج کے افسانے کا المیہ یہ ہے کہ افسانہ بہت آگے، تنقید بہت پیچھے ہے۔ اردو افسانے کو مغربی ممالک کے افسانے کے مقابل رکھا جائے تو اس کی کمزوریوں کا ادراک ہمیں صورتِ حال پر ہمدردانہ غور کرنے پر مائل کرتا ہے۔ پاکستان کے معاشرے میں روز افزوں بڑھتی ہوئی مذہبی انتہا پسندی، منقسم عوام، مقتدر طبقے، کالے انگریزوں اور سرکار کی انگریزی نوازی اور سرپرستی اور ہندوستان میں رسم الخط کی ٹیڑھ اردو افسانے کی ترقی کی راہ میں حائل بظاہر ناقابلِ تسخیر سنگ ہائے گراں ہیں۔ مجموعی طور پر جو صورتِ حال سامنے آتی ہے وہ حوصلہ شکن ہے۔ اس کے باوجود آج کا اردو افسانہ اعلیٰ ادبی معیاروں کے جس قدر قریب ہے وہ لائقِ تحسین ہے۔

ڈاکٹر سید سعید نقوی کا یہ دوسرا افسانوں کا مجموعہ ان کے شاندار تخلیقی کارناموں کا نقیب ہے، انتہا یا نقطۂ عروج نہیں۔

عبداللہ جاوید

مئی ۲۰۱۱ء

مسی ساگا، کینیڈا

ذاتی بات

امریکہ میں بیٹھ کر کچھ تخلیق کرنا بہت محفوظ مشغلہ ہے۔ پڑھنے اور سمجھنے والوں کی بڑی تعداد سمندروں کے اس پار بستی ہے۔ اور تحریر اگر نامعقول بھی ہو تب بھی خالق پتھراؤ سے محفوظ رہتا ہے۔ اسے حسنِ اتفاق کہیے یا آپ جیسے پڑھنے والوں کا حسنِ ظن کہ افسانوں کے پہلے مجموعے 'نامہ بر' کے جواب میں ادھر اور ادھر دونوں جانب سے صرف پھول ہی پھول آئے۔ پذیرائی میری توقع سے کہیں زیادہ بہتر ملی۔ نتیجہ آپ بھگت رہے ہیں کہ اب افسانوں کا دوسرا مجموعہ 'دوسرا رخ' آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم نے تو لکھ دیا اب آپ پر چاہے جو بیتے۔ ویسے بھی امریکی بھلا کب سے لحاظ کرنے لگے کہ آپ پر کیا بیت رہی ہے۔

'ادھر کچھ دنوں' سے ایک نئی اصطلاح 'اردو کی نئی بستیاں' قبولیت پا رہی ہے۔ میرے خیال میں 'اردو کی مہاجر بستیاں' کہیں تو زیادہ قریب از حقیقت ہوگا۔ ان بستیوں میں اردو لکھنے، پڑھنے اور اوڑھنے والے عموماً وہ مہاجرین ہیں جن کی پیدائش امریکہ کی نہیں ہے۔ بات تو جب ہے کہ اسی بدیسی زمین سے ایک ایسا نخل آبیاری پائے کہ جس کی تخلیق کی خوشبو محبانِ اردو کو مسحور کر دے۔ امریکہ کے کچھ بڑے شہروں میں اردو کے چند دیوانے کوشاں ہیں کہ یونی ورسٹیوں میں شعبۂ اردو قائم ہو کہ جہاں طلبہ اردو ویسے ہی شوق سے پڑھیں جیسے لاطینی، ہسپانی یا عربی۔

لیکن یہ سعی اب تک بس سعی ہی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان معلموں کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں۔ نئی سوچ، نئی اختراعات اور out of the box فکر کی ضرورت ہے کہ پردیس میں پیدا ہونے والے نوجوانوں کو کیسے اردو کی طرف راغب کیا جائے۔ ورنہ اردو کی نئی بستیاں اپنی نشونما کے لیے مہاجرین کی آمد کی رہینِ منت رہیں گی۔

وطنِ مالوف سے ہنوز صرف ' کھلے خطوط' آرہے ہیں۔ وہ قوم جس نے گوروں کی غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالیں، پے در پے فوجی آمروں کو نکال باہر کیا وہ مذہبی انتہا پسندی کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی ہے۔ قدرت نے اپنے تئیں تنوع میں حسن دیکھا تھا، لیکن یہاں متنوع اور مختلف قابلِ گردن زدنی ٹھہرے ہیں۔ ضروری ہے کہ ہمارے شاعر، صورت گر اور افسانہ نویس ہمیں اس اضطراب سے نکلنے کا راستہ دکھائیں۔ میری ناچیز رائے میں وہ مزاحمتی ادب نہیں لکھا جارہا جو وقت کی ضرورت ہے اور جس سے بحث کا آغاز ہو۔ اور ہو بھی کیسے۔ اختلافی نوٹ لکھنے اور سوال کرنے کی سزا اتنی پر تشدد ہو چکی ہے کہ غریب تخلیق کار جان وعزت بچائے یا سماج سدھار ادب لکھے۔ جو بھی ہو انھی حالات میں ہمیں فیضؔ، جالبؔ اور ارون دتی رائے پیدا کرنے ہیں۔ میرے خیال میں تو اس ماحول میں نئی بستی والوں پر زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ورنہ یہاں تو حال یہ ہے کہ میری پہلی کتاب ' نامہ بر' پر ایک نقاد نے 'روشنائی' میں تبصرہ لکھا کہ ویسے تو سعید نقوی کے افسانے بہت اچھے ہیں۔ لیکن ان کے افسانے ' دین کے محافظ' میں کراچی کے جو حالات بیان کیے گئے ہیں وہ امریکہ میں بیٹھے ایک ناواقف کی کم علمی کا ثبوت ہیں ورنہ کراچی میں تو ہر طرف چین ہے۔ انھیں میری اس کم علمی سے بہت کوفت ہوئی۔ اب یہی ہوسکتا ہے کہ اپنا نام بدل کر شتر مرغ رکھ لوں کہ شاید مجھے بھی طوفان نظر نہ آئے۔

جو چیزیں مجھے تنگ کر رہی ہیں وہ یقیناً آپ کو بھی کچھ کے لگاتی ہوں گی۔ میں نے یہاں ایک کہانی ایک فسانہ چھیڑ دیا ہے۔ آپ اس میں اپنی مرضی کے رنگ بھر لیجیے۔ بات سے بات نکلے گی تو خود ہی اپنا راستہ نکال لے گی۔ میں اپنی شریکِ حیات ثمرین کا مشکور ہوں کہ ستائیس سال سے مستقل مزاجی سے مجھے برداشت کر رہی ہے۔ ورنہ یہ شاعر اور افسانہ نگار اکثر بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ وہی میرا Sounding Board ہے اور ہر افسانے کی پہلی قاری۔

اس کے صائب مشوروں سے کہانیوں کی نوک پلک بنتی سنورتی رہتی ہے۔ سرورق کے لیے ایک بار پھر اپنی بھانجی علینہ زیدی کا مشکور ہوں۔ جب اس نے مجھے اپنی یہ پینٹنگ 'Child Bride' دکھائی تو اس سجی بنی کم عمر دلہن کے خوبصورت چہرے کے پیچھے مجھے وہ دوسرا رخ دکھائی دیا جو اس کتاب کے بیشتر افسانوں کا وصف ہے۔ اس کی تخلیق سے مجھے اپنی کتاب کا نام اور اس کا سرِورق مل گیا، شکریہ علینہ زیدی۔

ڈاکٹر سید سعید نقوی

نیویارک ۱۶/ جولائی ۲۰۱۱

آٹو ورکشاپ

چوہدری افتخار سے مل کر آپ بھی اتنا ہی خوش ہوتے جتنا میں ہوا تھا۔ نیو یارک ایک بے رحم اور ظالم شہر ہے۔ پرانی کاروں کے مالک دیسی نیو یارک میں' پاک آٹو ورکس' کو ایسا نشانِ ظفر جانتے تھے، جہاں اپنا مارے چھاؤں میں کا سکون تھا۔ برِصغیر سے امریکہ ہجرت کیے ہوئے لوگ، جنھیں عرفِ عام میں 'دیسی' کہتے ہیں کھنچے آتے تھے۔ اس کے باہر اردو میں 'ڈینٹنگ پینٹنگ' ایسے لکھا تھا جیسے نیو یارک نہ ہو، لالوکھیت کے کسی کونے پر واقع 'استاد جی' کا ورکشاپ ہو۔ چوہدری افتخار پاک آٹو ورکس کے بلاشرکتِ غیر مالک تھے۔ چھوٹا قد، کسرتی بدن، کھلتا ہوا گندمی رنگ۔ بالوں کی سرحد پیشانی سے بہت تیزی سے ہزیمت کھائی فوج کی طرح پیچھے سرک رہی تھی۔ توند تھی تو ضرور لیکن زیادہ نہیں، بس یوں سمجھ لیں کہ وہ سر جھکا کر دیکھیں تو اپنا پاؤں دیکھ لیتے۔ یہ بات آج تک معمہ ہے کہ رنگین گیلس (suspenders) کا استعمال انھوں نیو یارک آ کر شروع کیا تھا یا گجرات کا تحفہ ہے۔ دیسیوں کو اپنے ورکشاپ میں لانے کے لیے ایسے ایسے گُر اور حربے استعمال کرتے کہ مجال ہے کوئی بچ نکلے۔

سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے آٹو میکینک اور پلمبر سے ازلی خوف آتا ہے۔ انجانی، نامعلوم سوداکاری کا خوف۔ کسی تاریک گلی میں کسی اجنبی سے لُٹ جانے کا خوف۔ اس بات کو وہ لوگ

بہتر سمجھ سکتے ہیں، جنھوں نے غیر ملکیوں کو کراچی کے صدر کے علاقے میں قالین کا بھاؤ تاؤ کرتے دیکھا ہے۔ زبان سے زیادہ انگلیاں، بھنویں اور آنکھیں چلتی ہیں۔ ٹوٹی، پھوٹی گاہک کی اردو، ذہن میں پلتے وسوسے چہرے پر لکھے ہوتے ہیں۔ آپ قالین اس کو مفت بھی دے دیں وہ غریب اسی تذبذب میں رہتا ہے کہ اسے بے وقوف نہ بنایا گیا ہو۔ اسی طرح مجھے زبانِ میکینک ترکی تمی دانم محسوس ہوتی ہے۔ ظالم کچھ ایسے کچوکے لگاتے ہیں کہ آپ آہ بھی نہیں کرسکتے۔ بلکہ خوشی خوشی لٹ آتے ہیں کہ مستری صاحب نے گاڑی کو، جو بقول ان کے 'آخری سانسوں پر تھی' نئی زندگی بخش دی۔ اب اس میں آپ کی مہینے کی چوتھائی تنخواہ چلی گئی تو اس میں ان کا کیا قصور؟

چوہدری افتخار کی ہمسائیگی سے مجھے لگا کہ اب میں بھی یہ زبان سیکھ جاؤں گا، فر فر بولنے لگوں گا۔ جہاں میکینک نے اسپارک پلگ کی بات کی جھٹ میرے دماغ میں پلگ روشن ہوگیا۔ یہ لالچ تو خیر تھی ہی، مگر ایمان داری کی بات یہ ہے کہ میرے پاس چوہدری افتخار کی ہمسائیگی کے سوا کوئی چارہ تھا بھی نہیں۔ لہٰذا جب ایک مشترک دوست نے چوہدری صاحب سے ملوایا کہ ان کی ورکشاپ کے برابر میں ایک بڑی دکان خالی ہے، جس میں مطب کھل سکتا ہے تو میں ذرا ہچکچایا۔ لیکن جب یہ بات سمجھائی گئی کہ چوہدری صاحب کے ہاں آنے والے عموماً کسی دیسی ہی ڈاکٹر کی تلاش میں رہتے ہیں تو میں نے فوراً حامی بھر لی۔ چوہدری صاحب کو اس لین دین سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ اپنی مذکورہ و غیر مذکورہ کمی بیشیوں کو بیان کر کے مفت طبی مشورہ پاتے تھے۔ ایسے مسائل جن میں خفت کا اندیشہ ہو وہ کسی دوست یا جاننے والے کے حوالے سے بیان کرتے۔ خیر اس باہمی افہام و تفہیم سے ہمارے تعلقات ایک خوشگوار روش پر قائم ہو گئے۔

مطب کے ابتدائی دنوں میں مریضوں کا رش کم ہوتا تو میں اکثر چوہدری صاحب کی طرف جا نکلتا، جس کو میں مذاقاً ان کی کلینک کہتا تھا۔ تو شروع میں یہ معمول بن گیا کہ اگر کوئی مریض نہ ہوا، جیسا کہ اکثر ہوتا تھا، تو نرس کو ہدایت کر کے چوہدری صاحب کی ورکشاپ اٹھ آتا۔ مریض بھولا بھٹکا آ نکلتا تو نرس پچھلے دروازے سے آ کر مجھے بلا لیتی۔

انھی ملاقاتوں سے مجھے چوہدری صاحب کی دلچسپ شخصیت کا اندازہ ہوا۔ کاروں کی

نفسیات کو سمجھنا، ان کے تمام امراض کی درست تشخیص اور پھر کامیاب علاج چوہدری صاحب کی خاصیت تھے۔ کسی دائی کی طرح وہ کار کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر معاملے کی نوعیت بھانپ لیتے۔ کراچی کی طرز پر چوہدری صاحب نے دو 'چھوٹے' بھی رکھ چھوڑے تھے۔ ان میں سے ایک ہسپانوی اور ایک پاکستانی، دونوں غیر قانونی تارکِ وطن تھے۔ جیسے ہی کوئی کار ورکشاپ آتی یہ دونوں اسے ٹھونک بجا کر دیکھتے، پھر چوہدری صاحب کو رپورٹ کرتے۔ چوہدری صاحب کو اپنے ان فرشتوں پر پورا بھروسا تھا۔ خود کم ہی زحمت کرتے، ان ہی کی رپورٹ پر کارروائی ہوتی۔ خرچ کا تخمینہ بنتا اور گاہک سے معاملات طے ہوتے۔ ہسپانوی چھوٹے کی وساطت سے ہسپانوی بولنے والے بھی آیا کرتے تھے۔ وہ بھی دیسیوں کی طرح ایسی جگہ جانا چاہتے تھے جہاں اپنی زبان بول سکیں، بھاؤ بھی چکا سکیں اور کام سستا کرا سکیں۔

'چوہدری صاحب کیا اچھی گاڑی ہے' ایک مرسڈیز داخل ہوئی تو میں نے اعلان کیا۔

'ہاں ڈاکٹر صاحب یا تو ظاہر اچھا ہو یا کارکردگی۔ بس یہی دونوں عزت پاتی ہیں، ورنہ تو ٹھڈے ہی ملتے ہیں۔'

'اچھا، تو بھلا مرسڈیز میں کیا اچھا ہے؟'

'ڈاکٹر صاحب۔۔ ایسے بھولے بھی نہ بنو۔ یہ تو خاص الخاص ہے، ظاہر بھی اچھا اور باطن بھی زبردست، اس کی بابت کیا پوچھتے ہو۔'

'اچھا' میں نے چوہدری کی گفتگو سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پوچھا۔' تو اگر ظاہر بیہودہ ہو اور باطن اچھا؟'

'تو پھر اس کو تو کھوجنا پڑے گا ڈاکٹر صاحب۔ ورنہ چانس تو یہی ہے کہ آپ ظاہر دیکھ کر ہی پانا لگا دیں گے۔ وہ تو اگر قسمت سے ہم جیسے کسی جوہری کے ہاتھ لگ جائے تو شاید بھانپ لیں، ورنہ بڑا ٹائم لگ جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ خوشبو کی طرح شہرت پھیلتی ہے۔ وقت بڑا خراب ہوتا ہے اس میں۔ بہتر یہی ہے کہ اگر اندر سے کاروائی اچھی ہے تو باہر سے بھی ذرا نک سک درست ہو، اس سے فوراً دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔'

'اور جو خالی ظاہر ہی ظاہر ہو؟'

'آپ کیا ظاہر و باطن نکال کے بیٹھ گئے ڈاکٹر صاحب۔ ظاہر اچھا ہو اور کارکردگی صفر ہو تو سمجھو خطرے کی گھنٹی بج رہی ہے۔نہیں جناب ایسی گاڑی بالکل نہ لینا'۔ ابھی حکمت کے یہ سبق جاری تھے کہ مجھے میری نرس بلانے آ گئی۔

شروع کے کئی ماہ یہی ماحول رہا۔ چوہدری افتخار مجھ سے کہیں زیادہ مصروف تھے۔ لیکن لگتا تھا میری رفاقت سے انھیں بھی لطف آتا تھا۔ غالباً میرے سوالات سے انھیں میری کم علمی اور اپنی لیاقت کی سند ملتی تھی۔ ایک بڑی آٹھ سیٹوں والی وین کو ایک خوبصورت سی خاتون چلا کر لائیں اور عین چوہدری افتخار کے کمرے کے سامنے وین پارک کی۔ لگتا تھا وین کو کسی ڈنڈے سے پیٹا گیا ہو۔ جگہ جگہ ڈینٹ پڑے تھے اور رنگ اکھڑ رہا تھا۔تھوڑی دیر میں چوہدری صاحب کے دونوں چھوٹے اپنی رپورٹوں کے ساتھ حاضر تھے۔

'ٹائمنگ بیلٹ ٹوٹی ہوئی ہے' چھوٹو نے انکشاف کیا۔

'لیکن بریک پیڈ بالکل نئے ہیں موٹو کی رپورٹ زیادہ مثبت تھی۔

'ٹائی راڈ بھی ٹوٹنے کا خطرہ ہے' چھوٹو کی فہرست ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

'لیدر کی سیٹیں ہیں' موٹو گویا ہوا۔

باری باری دونوں رپورٹ دیتے رہے۔ چھوٹو کی لسٹ کیا تھی مسائل کا ایک انبار تھی۔ جبکہ موٹو گاڑی کی خوبیاں گنوا رہا تھا۔

'ہوں' چوہدری صاحب نے کچھ سوچ کے ہنکارہ بھرا۔سسپینشن (suspension) صحیح کام کر رہا ہے؟' انھوں نے چھوٹو سے دریافت کیا۔

'نہیں لگ رہا ہے کہیں گر پڑا ہو، نام ونشان بھی نہیں'۔ چھوٹو کو لگتا تھا ان خرابیوں سے مسرت حاصل ہو رہی تھی۔

'تم نہ بتاتے تب بھی مجھے یقین تھا۔' اسی لیے خاص طور پر اسی کے بارے میں پوچھا۔ چوہدری صاحب نے بڑے افتخار سے مونچھوں پر تاؤ دیا۔

'یہ سسپینشن کیا بلا ہے چوہدری افتخار' میں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

'بس یوں سمجھ لو ڈاکٹر صاحب جیسے گاڑی کا دماغ ہے، گاڑی کا ہر فعل یہی کنٹرول کرتا ہے۔'

'تو چوہدری صاحب آپ نے بغیر اسٹول سے ہلے یہاں کمرے کے اندر سے یہ کیسے جان لیا کہ اس کا سسپینشن نہیں ہے۔'

'ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب' چوہدری کی آواز میں مسرت انگیز شعبدے بازانہ رچاؤ تھا۔ 'دیکھیں دونوں طرف سے اس کی باڈی ٹھکی ہوئی ہے، ادھر ٹکرائی، اُدھر ٹکرائی۔ اس کو دھکا اس کو مار۔ یہ بغیر سسپینشن کی کاروائی ہے۔ سسپینشن ہو تو گاڑی اپنی سمت کو قابو رکھتی ہے اور نہیں ہو تو حالات اس کو قابو رکھتے ہیں۔'

'کیا مطلب میں سمجھا نہیں' میں نے الجھ کر پوچھا۔

'بھولے ڈاکٹر صاحب کیوں بن بن کر ہمیں بنا رہے ہو۔ سب سمجھتے ہو لیکن سمجھنا نہیں چاہتے۔ اس میں کیا دشوار بات تھی۔ سمت سیدھی ہو تو بھلا فکر ہو سکتی ہے؟ نہیں ہو سکتی ناں۔ بس یہی تو کہہ رہا ہوں۔ اچھا جانے دیں۔ چل چھوٹو میڈم کو ذرا حساب بتا دے۔ لگتا ہے یہ گاڑی میڈم کے ہاتھوں کھلونا بنی رہی ہے'۔

'لیکن چوہدری افتخار آپ کے ہاتھوں میں بھی جادو ہے، گاڑی کو ایسا نیا کر دیتے ہیں کہ ایکسیڈنٹ کا پتہ ہی نہیں چلتا۔'

'نہیں ڈاکٹر صاحب گاڑی تو میں صحیح کر بھی دوں لیکن پھر لڑ جائے گی۔ اس کا سسپینشن جب تک درست نہیں ہو گا یہ ایسے ہی اپنے آپ کو نقصان پہنچاتی رہے گی۔ بس ڈر یہ ہے ایک دن معاملہ بالکل قابو سے باہر نہ ہو جائے۔'

'چوہدری افتخار آپ کو تو فلسفی ہونا چاہیے۔' اس سے پہلے کہ چوہدری افتخار مزید رازوں سے پردہ اٹھاتے، نرس مجھے بچا کر لے گئی۔ ایک ہفتہ کچھ ایسا مصروف گزرا کہ چوہدری صاحب سے ملاقات کی نوبت نہ آئی۔

' آیئے ڈاکٹر صاحب کہاں غائب رہے آپ، کب سے نہیں آئے' چوہدری افتخار کا استقبال ہمیشہ کھل کر اور پرتپاک ہوتا تھا۔

'بس یار کچھ مریض بڑھ گئے ہیں موقع ہی نہ ملا۔'

'اوئے بلے بلے، مبارکاں جی، میں نہ کہتا تھا بس وقت کی دیر ہے۔ آپ تو بڑے قابل

لوگ ہیں کچھ دنوں میں آپ کے پاس ہمارے لیے بالکل وقت نہیں ہوگا۔'

'ارے نہیں چوہدری صاحب ایسا بھلا کیسے ہوسکتا ہے' میں نے انھیں یقین دلایا۔

'ہوگا ڈاکٹر صاحب ایسے ہی ہوگا' اس کے لہجے میں تجربے کی قطعیت تھی۔

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا، ایک وین دکان میں داخل ہوئی، لگتا تھا پورا خاندان کسی سفر پر روانہ ہے۔ اوپر تک سامان بھرا تھا۔ اور وین میں تقریباً تیرہ لوگ بھی سوار: چھ بچے، چار جوان اور تین ادھیڑ عمر کے لوگ۔ ڈرائیور کے چہرے سے تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ گاڑی کے سائلنسر سے گاڑھا سیاہ دھواں نکل رہا تھا اور سامنے بونٹ سے بھی کچھ آوازیں آرہی تھیں۔

'کیسی آواز ہے چوہدری. چھوٹو کے آنے سے پہلے بتانا ہے' میں نے مسکرا کے چوہدری افتخار کو چیلنج کیا۔

'احتجاج کی آواز ہے ڈاکٹر۔ خطرے کا بھونپو۔ اوقات سے زیادہ وزن اٹھالیا ہے۔ دیکھیں بھائی بنانے والا گاڑی کو کارخانے سے نکالنے سے پہلے اس کے اوقات مقرر کردیتا ہے۔ کاربوریٹر کتنے دن چلے گا۔ سائلنسر کب تک ساتھ دے گا، ڈسٹری بیوٹر کی کتنی عمر مقرر ہے۔ اب اگر گاڑی اپنی عزت کرے گی تو یہ اپنی معیاد بھی پوری کرے گا۔ تو آپ اپنے ایمان سے کہیں، بنانے والا کیا کرے۔ یہی حال اس وین کا ہے۔ دیکھ نہیں رہے اس ایک جان پر بارہ نفر تکیہ کیے بیٹھے ہیں۔ وقت سے پہلے اس کا وقت آجائے گا۔ بس یہی وارننگ آرہی ہے بونٹ کے نیچے سے۔'

'ارے چوہدری صاحب تو یہ سواریاں کچھ کرتی کیوں نہیں؟'

'ڈاکٹر صاحب سواریاں صرف اپنی مرضی کی آوازیں سنتی ہیں۔ باقی آوازوں سے کان کا پردہ ہے۔ سواریاں کیا باؤلی ہیں جو احتجاج پر کان دھریں گی۔ یہ غریب وین رک بھی جائے تو دوبارہ اسے دھکے سے اسٹارٹ کردیں گے۔ اب دیکھیں کم از کم تین اہم پرزے جواب دے چکے ہیں۔ زمانہ اتنی ترقی کرگیا ہے کہ یہ تین پرزے بدل دو اور گاڑی دوبارہ پانچ سات سال کے لیے چالو اور اگر نہیں ملے تو کسی اور گاڑی کا نکال کر لگا دیں گے۔ ان پرزوں کی اپنی ایک چور مارکیٹ ہے۔ اگر آپ ٹویوٹا میں ٹویوٹا کا ہی پرزہ لگاؤ تو زیادہ مزہ ہے ورنہ کاریگر تو ٹویوٹا میں ہونڈا کا پیوند بھی لگا دیتا ہے۔ ذرا اسپیشل قسم کا گریس وغیرہ لگا کر اسے چلائے رکھتے ہیں، کیا کیا

تماشے ہیں ڈاکٹر صاحب۔'

'چوہدری صاحب آپ لوگوں کو بتاتے کیوں نہیں کہ اب گاڑی کو آرام کرنے دیں، کوئی دوسری صورت نکالیں؟'

'یہ کیا بات کی آپ نے، ہاتھی گنے سے دوستی کرے گا تو کھائے گا کیا؟ پھر میرا کام گاڑی ٹھیک کرنا ہے، اصلاح معاشرہ نہیں۔ اور یہ کون سی میری بات مان لیں گے۔ بس یہ کہ گاڑی میرے گیراج سے نکال کر کسی اور کے گیراج میں لے جائیں گے۔'

'اچھا چھوڑیں چائے تو پلوائیں' میں نے چوہدری افتخار کا موڈ بحال کرنے کے خیال سے کہا۔

'ہاں یہ اچھی بات کی ہے آپ نے، چھوٹو یہ ساتھ والے اسٹار بکس سے دو چائے تو لے کر آ بھاگ کر۔'

'چوہدری صاحب آپ اپنی گاڑی تو بالکل چمکا کر رکھتے ہیں' میں مسلسل اس کا موڈ بحال کرنے میں لگا تھا۔

'ہاں جی ۲۰ سال کا بے داغ ریکارڈ ہے۔ میں نے دوسروں سے سبق سیکھا ہے۔ ہمیشہ قانون کے اندر گاڑی چلاتا ہوں۔ کبھی پولیس والے کو موقع ہی نہیں دیا کہ مجھے روک سکے۔ آپ اپنا دامن بچانا پڑتا ہے جی۔ لو جی آپ کی چائے آگئی۔'

اسی بھاگ دوڑ میں دن گزر رہے تھے۔ میری پریکٹس بھی کچھ چل پڑی، دن میں اچھے خاصے مریض آجاتے، ان میں زیادہ تعداد دیسیوں کی تھی۔ میں جو پہلے ان کے آنے سے بہت خوش ہوتا تھا، اب ان مریضوں سے گھبرانے لگا تھا۔ ایک روز موقع نکال کر ورکشاپ جا گھسا۔ دیکھا تو چوہدری صاحب کے کمرے میں ایک امریکی خاتون بیٹھی ہیں۔ مجھے محسوس یہ ہوا کہ شاید میں اسے کہیں دیکھ چکا ہوں، یہی کوئی پینتیس کا سن ہوگا۔ بہت دلکش چہرا، اس پر شانوں تک کٹے سنہری بال، بہت اہتمام اور سلیقہ سے آراستہ تھے۔ غور سے دیکھا تو یاد آیا کہ یہ وہی خاتون ہیں جو اس دن آٹھ سیٹوں والی وین چلا کر لائی تھیں۔ میں نے دخل درمعقولات کو نا مناسب جانا اور الٹے پاؤں لوٹ گیا۔ پھر یہ ہوا کہ وہ خاتون وقتاً فوقتاً نظر آنے لگیں۔ یہ ذرا اچنبھے کی بات

تھی۔ آپ کی گاڑی اگر خراب ہو تو ایک آدھ مرتبہ میں ٹھیک ہو جاتی ہے۔ ویسے تو چوہدری صاحب لنگوٹ کے پکے تھے، لیکن بہت سے دیسی گوری خواتین سے ۱۸۵۷ء کی توہین کا بدلہ لینے پر آمادہ رہتے ہیں۔ اس بات سے زیادہ فرق نہیں پڑتا کہ وہ گوری قوم برطانوی تھی اور یہ امریکی، بھئی گوری تو ہے ناں۔

مجھ سے رہا نہ گیا، ایک دن چوہدری سے پوچھ ہی بیٹھا:

'چوہدری صاحب، آج کل ایک بلونڈ بہت نظر آ رہی ہے آپ کے گیراج میں، خیریت تو ہے؟'

'ہاں ڈاکٹر صاحب، بیچاری بیوہ ہے۔ اس کی گاڑی کے سارے ڈینٹ تو نکال دیے تھے۔ وہ کام اس کو اتنا پسند آیا تھا کہ اپنے دوسرے دکھڑے لے بیٹھی۔ پریشان بیوہ ہے، کسی کاروبار کی تلاش میں ہے۔ کہتی ہے تم نے ایک غیر ملک میں اتنا کامیاب کاروبار چلایا ہے، یقیناً یہ تمھارے مزاج کا حصہ ہے۔ کچھ نکتے مجھے بھی سکھاؤ۔'

'چوہدری صاحب بیوہ کی مدد کرنا تو بہت اچھی بات ہے۔ ذرا خیال رہے ایسا نہ ہو ان کی وین آپ کے گیراج میں ہی پارک ہو جائے!'

'لو جی ڈاکٹر صاحب آپ تو مذاق اڑانے لگے' چوہدری صاحب کا لہجہ شکایتی تھا۔ مجھے خود اپنے رویہ پر ذرا ندامت سی ہوئی، بات آئی گئی ہو گئی۔

پھر ایک روز سنا کہ چوہدری صاحب گرفتار ہو گئے۔ چھوٹو بھاگتا ہوا کلینک آیا۔ چوہدری صاحب نے فون کر کے اسے اپنی نئی رہائش گاہ کی اطلاع دے دی تھی۔ یہ بھی تاکید کہ جیسے ہی میری کلینک کھلے، چھوٹو مجھ سے آ کر ملے اور مجھے ضمانت کے لیے رضامند کرے۔ میں اس صورتِ احوال سے زیادہ خوش نہیں تھا، لیکن مرتا کیا نہ کرتا، چوہدری صاحب کی ضمانت کرا لایا، ہمسائے کا بہت حق ہوتا ہے۔

'کیا معاملہ ہوا چوہدری صاحب۔ کوئی ٹیکس وغیرہ کا سلسلہ تھا؟'

'نہیں ڈاکٹر صاحب وہ بلانڈ لڑکی وہ تو بہت حرافہ نکلی۔ دیکھنے میں کیسی مرسڈیز تھی اندر سے بالکل پھٹ پھٹی۔ ایسے ہی ہے سر جی، جیسے آپ کوئی نئی گاڑی لیں، بعد میں پتہ چلے اس کا

تو اسپیڈومیٹر پھرایا گیا ہے۔ یہاں مجھ جیسا تجربہ کار میکینک بھی مار کھا گیا۔'

'میکینک کا ہی فرق نہیں چوہدری صاحب، جینز (Genes) کا بھی فرق ہے۔ بس یہی بات تو ممتاز رکھتی ہے ہمیں کہ ہمارے سسپینشن میں چکر دینے والی گراری فٹ کی ہوئی ہے۔ ایسی کوئی اور کار آپ کی نظر سے گزری ہو تو بتاؤ۔'

چوہدری افتخار اس وقت خود چکرایا ہوا تھا، ان چکروں کو کیا سمجھتا۔ اس روز میں نے اسے ایک دوسرے ہی روپ میں دیکھا۔ اس بلونڈ کو دل بھر کے غلاظت بھری لعن طعن، مزہ چکھا دینے کے عزائم، نہیں چھوڑوں گا کے وعدے۔ سچ ہے آدمی کا باطن غصے میں ہی نظر آتا ہے۔ عام حالات میں ظاہر کا ملمع بہت سے عیب چھپا لیتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اس لڑکی کی بیوگی فراڈ تھی۔ دھوکے سے انشورنس کا پیسہ حاصل کیا اور چوہدری افتخار اس کے ساتھ کاروبار میں ساجھا کر بیٹھے۔ معاملہ کھلا تو ساجھے داری گلے پڑ گئی۔ اب میرا آنا جانا ورکشاپ میں خاصہ کم ہو گیا تھا۔ ایک تو میری اپنی مصروفیت پھر دوسرے یہ کہ اس دن کے واقعہ اور خاص طور پر چوہدری افتخار کے مکالموں نے طبیعت کچھ مکدر کر دی تھی۔ میں اپنے مریضوں کی یکسانیت سے بھی ذرا تنگ تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ جگہ بدل لوں۔ سنا ہے چوہدری صاحب پھر اس بلونڈ لڑکی کے ساتھ نظر آنے لگے تھے۔

'ارے چھوٹو، دیکھ تو عید کا چاند نکل آیا ہے چوہدری صاحب نے مجھے کئی ہفتے کے بعد گیراج میں داخل ہوتے دیکھا تو فقرہ کسا۔

'کیوں ڈاکٹر صاحب یہ میں کیا سن رہا ہوں، آپ یہاں سے کسی اور علاقے میں منتقل ہونا چاہ رہے ہو؟'

'نہیں، نہیں چوہدری صاحب، میں ایک اور جگہ بھی مطب کھول رہا ہوں۔ مریض تو کافی ہیں لیکن ان میں سے کئی پیسے نہیں دے پاتے۔ پھر یہ پریشر کہ یہ سرٹیفکیٹ دے دو، وہ پرچہ لکھ دو۔ ماں بیمار ہے تو بیٹی کی انشورنس سے دوا لکھوا رہی ہے۔ اپنوں کو منع کرتے ہوئے بھی جھجک ہوتی ہے۔ گورا مریض ہو تو اول تو اس کی ہمت ہی نہیں پڑتی، اور کوئی ہمت کر کے ایسے سرٹیفکیٹ مانگ بھی لے تو ان کو سختی سے ڈانٹا جا سکتا ہے۔'

'ڈاکٹر صاحب، ان کو اپنا بھی کہتے ہو، پھر ان سے تنگ بھی ہو۔ آپ چلے گئے تو یہ کس کے پاس جائیں گے۔ آپ سے کم از کم اپنی زبان میں بات تو کر لیتے ہیں۔ یہاں سے ہوسکتا ہے پیسے کم کما رہے ہو، لیکن دعائیں تو ضرور بہت زیادہ کما رہے ہوگے'۔ چوہدری مجھے بہت دیر سمجھاتا رہا تو میری نیت ڈانواڈول ہوگئی۔

تیرہ کا ہندسہ مغرب میں بہت منحوس سمجھا جاتا ہے۔ یہ ضعیف الاعتقادی اتنی زیادہ ہے کہ اکثر ہوٹلوں میں تیرھویں منزل نہیں ہوتی، تیرہ نمبر کمرہ نہیں ہوتا۔ اور اگر کہیں یہ تیرہ تاریخ جمعہ کو پڑ جائے تو سمجھ لیجیے قیامت سے کم نہیں ہے۔

یہ تیرہ تاریخ بھی جمعہ کے دن پڑی تھی۔ میں کلینک پہنچا تو چوہدری افتخار کا آٹو ورکس بند پایا۔ اتنے سالوں میں یہ پہلی دفعہ تھا کہ میں نے اسے بند دیکھا تھا۔ آندھی، طوفان، برفباری، ہفتوں کے ساتوں دن حتیٰ کہ تہوار کی چھٹی میں بھی چوہدری صاحب ہمیشہ اسے کھلا رکھتے۔

'بھئی گاڑی تو چھٹی کے دن بھی خراب ہوسکتی ہے میرے استفسار پر ایک مرتبہ انھوں نے بہت سادہ سا جواب دیا۔ خود چھٹی کر لیتے تو چھوٹو اور موٹو کام سنبھالے رہتے۔ ان کے گاہک پورے اطمینان میں رہتے کہ سال کا کوئی دن ہو یہ ورکشاپ کھلی ملے گی۔

مجھے اپنی کلینک کے باہر کھڑا دیکھ کر کہیں سے چھوٹو نکل آیا۔ آنکھیں سرخ تھیں جیسے نزلے کا شکار ہو۔

'کیا بات ہے چھوٹو، دکان کیوں بند ہے؟' چوہدری صاحب کے ساتھ میری بھی عادت پڑ گئی تھی انھیں چھوٹو موٹو کہنے کی۔ ایمان داری کی بات تو یہ ہے کہ مجھے ان کا اصل نام معلوم بھی نہیں تھا۔

'ڈاکٹر صاحب آپ نے نہیں سنا، چوہدری صاحب کا انتقال ہوگیا' چھوٹو نے گویا بم کا گولا چلا دیا۔

'ارے وہ کیسے، کل تک تو اچھے بھلے تھے۔ میں نے خود انھیں گاڑی میں بیٹھتے دیکھا تھا، کیا ہارٹ اٹیک ہوگیا؟ سگریٹ بھی تو بہت پیتے تھے بچارے۔'

'نہیں ڈاکٹر صاحب، چوہدری صاحب کا ایکسیڈنٹ ہوگیا' اب چھوٹو صاف رو رہا تھا۔

وہ کیسے، وہ تو بہت پرانے، ماہر اور محتاط ڈرائیور تھے؟

جی وہ خود نہیں چلا رہے تھے۔ وہ جو بلانڈ گوری آتی تھی ناں ہمارے گیراج میں، وہی جس سے جیل جانے پر چوہدری صاحب کا جھگڑا بھی ہوا تھا، وہ بہت تیز گاڑی چلاتی تھی۔ سگنل توڑ کر اس زور سے گاڑی ٹکرائی کہ کار نے آگ پکڑ لی۔ چوہدری صاحب گاڑی سے نکل ہی نہ سکے۔ وہ خود تو ہسپتال داخل ہے لیکن بچ گئی ہے۔ چوہدری صاحب اپنی گاڑی سمیت کوئلہ ہو گئے، کار سے نکل ہی نہ سکے۔

میں خالی خالی نظروں سے آٹو ورکس کے سامنے کھڑی گاڑیوں کو دیکھتا رہا۔ لگ رہا تھا میں ان کے آر پار دیکھ رہا ہوں۔ باقی سارا منظر غائب ہو گیا تھا۔ صرف گاڑیاں میری حدِ نظر کے احاطے میں تیر رہی تھیں۔ جن کے درمیان افتخار چوہدری کی گاڑی بچتی، بچاتی، موڑ کاٹتی اپنا دامن بچائے اوپر کی جانب محوِ سفر تھی۔ چوہدری صاحب اپنی گاڑی کی نبض سے تو واقف تھے لیکن نئے ڈرائیور کی تشخیص سے مار کھا گئے۔

بے لگام

دن بھر کی مسافت طے کر کے جب تھکا ہوا سورج حدِ نظر سے پرے کہیں چھپ کر آرام کرتا ہے، تو اس مٹیالے رنگ کے وکٹورین مکان کا دن بھی تمام ہوتا ہے۔ شمالی فلوریڈا کی زمین کھیتی باڑی کے لیے نہایت موزوں ہے۔ شمالی فلوریڈا ہی کیا، امریکہ کی مشرقی سرحد پر واقع بیشتر ریاستیں کھیتی باڑی کے لیے بہت زرخیز ہیں۔ شمال مشرق میں واقع میساچیوسٹس، نیو یارک، ڈیلاویئر، نیو ہمپشائر وغیرہ تو سردیوں میں صرف برف اگا سکتی ہیں، لیکن ذرا جنوب کی طرف سفر کیجیے تو شمالی اور جنوبی کیرولائینا، جارجیا، ٹینیسی اور فلوریڈا ایسی زرخیز زمینیں ہیں کہ مرزا نے اسی علاقے کو دیکھ کر کہا ہوگا کہ سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی، بن گیا روئے آب پر کائی۔

جارج شمالی فلوریڈا کے اس مٹیالے وکٹورین میں کم از کم تین نسلوں سے رہ رہا تھا۔ آئرلینڈ میں 'آلو کا قحط' پڑا تو جارج کے پر دادا نے پانی کے جہاز کا رخ کیا۔ سچ ہے کہ ڈھونڈنے والوں کو نئی دنیائیں ملتی ہیں، قدرت تو نوازنے کے بہانے ڈھونڈتی ہے، اک ذرا ہمتِ مرداں اور روایت کی زنجیریں توڑنے کی ضرورت ہے۔ آئرلینڈ کے دارالخلافے ڈبلن سے اٹھ کر جارج کے پردادا نے فلوریڈا میں قدم ٹکائے۔ یہاں قدم ایسے جمے کہ جو نحیف اجسام آئرش قحط سے بھاگے تھے، فلوریڈا آ کر خوب پھلے پھولے اور توانا ہوئے۔ نسل در نسل یہ مکان

اور اس کے ساتھ کی زرعی اراضی منتقل ہوتی رہی۔ اب جارج کے پاس اسی ایکڑ کی زمین تھی جس پر سال میں دو مختلف فصلیں تیار ہوتیں۔ گھر سے متصل ایک طویلہ تھا جس میں گھوڑے بندھے رہتے۔ اس کے علاوہ کئی سور اور گائیں زمین کو کھاد فراہم کرتیں جبکہ جارج کو دودھ اور گوشت۔ زندگی سہل نہیں تھی کہ کھیتی باڑی جسمانی مشقت اور خون پسینے کا خراج مانگتی ہے، مگر زندگی یوں فراغ ضرور تھی کہ گھر میں پیسے کی فراوانی تھی۔

ایمان کی بات تو یہ ہے کہ شام میں جب سورج ڈھلتا اور آسمان پر قسم قسم کے رنگ بکھر جاتے تو کہیں جا کر جارج کا دن بھی تمام ہوتا۔ آخر اس کا دن بھی تو صبح تڑکے پو پھٹنے سے پہلے شروع ہو جاتا تھا۔ چاہے معاملہ پانی کھولنے کا ہو یا دودھ دوہنے کا، کسان کا دن سورج کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے۔ جون کی اس خوبصورت شام بھی آسمان پر بہت سے رنگ سازشیں کر رہے تھے۔ جیسے طے نہ کر پا رہے ہوں کہ سورج کو شکست دینے کے لیے کون سی آمیزش بہتر ہے۔ نیلگوں آسمان پر اب سرخ اور سبز کی بہار تھی۔ جارج نے ٹریکٹر کو گیراج میں بند کیا، گھر کے صدر دروازے کو اندر سے چٹخنی لگائی اور باورچی خانے کی جانب بڑھ گیا، جہاں اس کی بیوی اور بیٹی لوسی رات کے کھانے کا انتظام کر رہے تھے۔ جیسے جیسے لوسی لڑکپن کی حدوں کو پیچھے چھوڑ رہی تھی، جارج کا کام نسبتاً آسان ہو رہا تھا۔ اب گھوڑوں کی مالش، ان کو دوڑانا لوسی کا مرغوب مشغلہ تھا۔ ورنہ بیچاری ماریہ تو شادی کے دو سال بعد ہی ایسے اعصابی بیماری کا شکار ہوئی تھی کہ جارج کا کام کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گیا تھا۔

نیالے وکٹورین مکان کا دن کیا تمام ہوا، ملحقہ اصطبل میں جیسے دن طلوع ہو گیا۔ چھ گھوڑوں کے اصطبل میں چار گھوڑے بندھے تھے۔

'میں بالکل کسی نئے گھوڑے کی آمد کے حق میں نہیں۔' نوجوان سفید گھوڑا ہنہنایا۔ شاندار جسم، بوٹی بوٹی الگ دیکھ لو، ایال پر سنہری بال، لمبی گھنیری دم، لاشبہ گھوڑے پن کا ایک عمدہ نمونہ۔

'کسی گھوڑے کی آمد کے حق میں نہیں یا اس گھوڑے کی آمد کے حق میں نہیں' ایک سیاہ فام گھوڑے نے طنز سے سوال کیا۔

'کیا مطلب؟'

'مطلب یہ کہ اگر کوئی سفید گھوڑا آ رہا ہوتا تو کیا تمھیں پھر بھی اتنا ہی اعتراض ہوتا' سیاہ گھوڑا خاصہ جہاندیدہ تھا۔

'ٹھیک کہہ رہے ہو، سفید گھوڑا ہوتا تو یقیناً اس سے ہمارا ہی فائدہ ہوتا، لیکن میں اس دھاری دار مخلوق کے بالکل حق میں نہیں، نجانے کس سیارے کی برآمد ہے؟'

'دھاری دار گھوڑے کی آمد سے تو ہمارے تنوع میں اضافہ ہوگا۔ اس کے تجربات سے ہمیں شاید نئی چراگاہوں کا پتہ ملے دوسرا سفید گھوڑا نسبتاً نرم خو اور کھلے دل کا تھا۔ اس دوسرے سفید گھوڑے کو ہم سفید گھوڑا نمبر دو کہہ سکتے ہیں۔

'ہمارے پاس کافی چراگاہیں ہیں، میں اپنی چراگاہوں کو کسی دھاری دار مخلوق سے آلودہ نہیں کرسکتا۔ پھر ہماری اپنی نسل کی ملاوٹ کا اندیشہ ہے' سفید گھوڑے نے دزدیدہ نظروں سے گھوڑی کی جانب دیکھا، جو سب سے کونے میں بندھی، سرنیچا کیے چارے پر ہاتھ صاف کر رہی تھی۔

سیاہ گھوڑے نے ہنہنا کر گویا اپنی موجودگی کی یاددہانی کرائی۔

'ہم نے پہلے کیا کم قربانی دی ہے، ماحول پہلے ہی آلودہ ہو چکا ہے، اب اس دھاری دار مخلوق کے آنے سے یہ اصطبل رہنے کے قابل نہیں رہے گا' سفید گھوڑا گویا اسپِ سیاہ پر نظر جھکائے خود کلامی کر رہا تھا۔

'ارے بھئی ہم چار ہیں اور یہاں چھ گھوڑوں کی گنجائش ہے۔ پھر تنگی کا کیا سوال ہے؟ سفید گھوڑے نمبر ۲ نے الجھ کر پوچھا۔

'تنگی صرف زمین یا علاقے کی نہیں ہوتی' اسپِ سیاہ نے معنی خیز گرہ لگائی۔

'میں اس دھاری دار مخلوق کو مار بھگاؤں گا۔ میرا سوال صرف یہ ہے کہ تم دونوں میرا ساتھ دوگے ہی نہیں؟' سفید گھوڑے نے لفظ دونوں استعمال کر کے گویا اسپِ سیاہ کو تنہا کر دیا۔

'اس کو دھاری دار مخلوق کہنا بند کرو۔ وہ ایک گھوڑا ہے ہمارے جیسا، جس کے جسم پر دھاریاں ہیں۔ اس کی بھی ایال ہے، دُم ہے، دو کان ہیں، آنکھیں ہیں، سب اعضا ہمارے جیسے ہیں۔ مجھے تو اس کی دھاری دار جلد بہت جاذبِ نظر لگتی ہے' گھوڑی نے ذرا شرما کے کہا۔

'دیکھا، دیکھا میں کیا کہتا تھا' سفید گھوڑے کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔

'لیکن یہ تو سوچو ہم خود کون سا اس زمین کی پیداوار ہیں۔ جارج کے پردادا کے ساتھ پانی کے جہاز پر سفید گھوڑوں کا ایک جوڑا نہ آتا، تو یہاں کون سے ہمارے اجداد بستے تھے' سفید گھوڑا نمبر دو مصالحت کی راہ نکال رہا تھا۔

'یہ زمین ہماری ہے، ہماری رہے گی۔ اسپِ سیاہ کی وجہ سے پہلے ہی ہماری نسل میں ایک گرہ لگ چکی ہے، اب مزید آلودگی میری لاش پر سے گزر کر ہوگی' سفید گھوڑے کا غصہ کم ہونے کو تیار نہ تھا۔ معاملہ اس حد تک بگڑتے دیکھا تو باقی تینوں گھوڑوں نے دم سادھ لیا، کہ خاموشی اکثر بلائیں ٹالتی ہے۔ مگر ریت میں سر دینے سے طوفان گزر جاتے تو سب صحرا میں سر دفنائے کھڑے رہتے۔ زیادتی کے سامنے اجتماعی خاموشی، بدتر از گناہ است۔

صبح ہوئی تو ہمیشہ کی طرح لوسی نے اصطبل کا دروازہ کھولا۔ سب گھوڑوں کو ایسے ہیلو کہا جیسے ابھی یہ سب بول ہی پڑیں گے۔ محبت سے سب کی گردنوں کو تھپتھپایا۔ اتنے میں باہر سے ٹاپوں اور ایک گھوڑا گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ لوسی نے باہر جا کر آنے والے گھوڑا گاڑی کے آگے جتے گھوڑے کی لگام تھام کر اسے تھپتھپایا۔ پھر خوشی خوشی گاڑی کے پیچھے بندھے دھاری دار گھوڑے کی رسی کھولی۔ اسے پیار سے تھپتھپایا۔ گھوڑے نے بھی اپنی ناک لوسی کے بازو سے رگڑ کر اس کی بو سے مانوسیت حاصل کی۔ ایک رحم دل انسان کی خوشبو تھی۔ دھاری دار گھوڑے نے نئے مالک کے آگے سر جھکا کر گویا وفاداری کی بیعت کی۔ لوسی اس کی رسی تھامے اصطبل کی جانب بڑھی۔ عموماً اصطبل لوسی کے داخلے پر گویا نیند سے بیدار ہو جاتا تھا۔ گھوڑوں کی کلیلیں سنائی پڑتیں، اس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے، گھوڑے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے۔ لوسی کو سب سے زیادہ پیار گھوڑی سے تھا۔ ماتھے پر ایک سیاہ داغ، چال میں ایک شاہانہ مستی، دوڑنے پر آئے تو باقی تینوں اس کی دھول چاٹتے رہ جائیں۔ دھاری دار گھوڑے کی لگام تھامے لوسی خوب رو سفید گھوڑے کے سامنے سے گزری تو وہ ہنہنا کر پچھلے قدموں پر کھڑا ہو گیا، دونوں اگلے کھر فضا میں معلق، قینچی کی طرح چلنے لگے۔ لوسی نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اس کی تندخوئی اور بد مزاجی سے لوسی واقف تھی۔ لیکن نئے جانور کا یہ استقبال، ابتدا کچھ اچھی نہ تھی۔ باقی دونوں گھوڑے ایسے گردن ڈالے چارہ کھانے میں مصروف رہے گویا اصطبل میں موجود ہی نہ ہوں۔ حالانکہ ان

کے دیدے اس دھاری دار گھوڑے پر اس وقت سے جمے ہوئے تھے جب لوسی اسے لے کر داخل ہوئی تھی۔ اب بھی مضحکہ خیز انداز میں منہ تو چارے کی بالٹی میں تھا مگر آنکھیں ماتھے پر دھری تھیں۔ جب ان دونوں نے بھی سرک کر جگہ نہ بنائی تو لوسی آگے بڑھ گئی۔ کونے میں کھڑی گھوڑی پہلے ہی ذرا سرک کر جگہ بنا چکی تھی۔ بالٹی سے منہ نکال کر ذرا سمٹ کے اصطبل کی دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ لوسی نے دھاری دار گھوڑے کی لگام وہیں زمیں میں گڑے کھونٹے سے باندھ دی اور گھوڑی کے سامنے کی بالٹی اس کے آگے سرکا دی۔ مڑی تو اس کی نظر اصطبل کے کونے کی چھت پر پڑی۔ بارشوں نے ترچھی کھپریل کی چھت میں رسنے کی جگہ بنالی تھی۔ کل رات کی بارش کا پانی اصطبل کی زمیں پر ابھی تک جذب نہیں ہوا تھا۔ جارج سے کہوں گی چھت ٹھیک کروانے کا وقت آ گیا ہے۔ امریکہ میں یہ نیا طرزِ گفتگو ہے کہ اکثر اولاد باپ کو اس کے اصل نام سے پکارتی ہے۔ شاید یہ یگانگت و رفاقت کی کوئی نئی حد ہے، کہ درمیاں سے ہر لقب ورشتہ کا پردہ اٹھا دیا جائے۔ مشرق ابھی اس حد کو پار نہیں کر پایا۔ لوسی خوبصورت سفید گھوڑے کے پاس سے گزری تو اس کے چاروں پاؤں اب زمین پر آ چکے تھے، ہنہنا کر لوسی کی توجہ کا طالب ہوا تو لوسی نے مایوس نہیں کیا۔ بڑھ کر اس کی گردن میں جیسے لٹک سی گئی اور اس کی پیشانی چوم لی۔ سفید گھوڑے کے جسم میں شرارے سے بھر گئے، دُم کھڑی ہو کر پشت سے آ لگی۔ اس نے بھی محبت سے لوسی کے شانے میں اپنا منہ گھسیڑ دیا۔

آج کام زیادہ تھا، اور پھر باہر بارش ہوتی رہی۔ گھوڑوں کو اصطبل سے آزاد نہیں کیا گیا۔ رات بھر اصطبل میں اودھم مچا رہا جس کی آوازیں بارش کے شور میں دب گئیں۔ لوسی اپنے نئے دھاری دار گھوڑے پر سواری کے لیے بے چین تھی۔ اسے دن بھر بارش کا افسوس رہا کہ سارا دن ضائع ہو گیا۔ نئے کھلونوں کی خوشی تو عمر کے ہر حصے میں حرارت کا باعث بنتی ہے۔ کروٹیں بدلتی رہی۔ بارش اب دن برباد کر کے رات کے سناٹے میں شور مچا رہی تھی۔ اصطبل پر چھت تنی ہوئی تھی اس لیے لوسی کو اطمینان تھا کہ اس کے گھوڑے آرام سے ہوں گے۔ چھت کے ٹوٹے حصے کا خیال آیا تو افسوس ہوا کہ جارج سے آج ہی کیوں نہ کہہ دیا۔

صبح تک بادل چھٹ گئے۔ فلوریڈا کے درو بام پھر سنہری رنگ کی دھوپ میں نہا گئے۔ رات کی برسات سے سارا ماحول نہایا ہوا لگ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے برسات نے سارے

موجوداتِ عالم کی پیاس بجھا کر انھیں تر و تازہ کر دیا۔ لوسی بھی موسم کی اس تراوٹ سے آزاد نہ تھی۔ چہرے پر تازگی، آنکھوں میں چمک، چال میں تجسس لیے اصطبل کا دروازہ کھولا تو غیر معمولی خاموشی پائی۔ دھاری دار گھوڑا کسی طرح لگام تڑا کر ٹوٹی چھت کے نیچے کھڑا تھا۔ سرخ ناک اور بھیگی ایال سے ظاہر تھا کہ ساری رات یہیں کھڑا بھیگتا رہا ہے۔

'میں نے کل ہی جارج سے کیوں نہ کہہ دیا' لوسی نے اپنے آپ کو کوسا۔

لپک کر کونے سے ایک چادر اٹھائی اور محبت سے دھاری دار گھوڑے کا بدن خشک کرنے لگی۔ اس محنت سے اس نے اس کے جسم کو رگڑا اور پونچھا۔ لوسی کے ماتھے پر صبح کی سردی کے باوجود پسینہ آ گیا۔ اس رگڑ سے دھاری دار گھوڑے کی کھال چمک کر عجیب شان دار ہو گئی۔ جان کے سارے مسام کھل گئے۔ اس نے گردن موڑ کر لوسی کو دیکھا تو آنکھیں جذبۂ تشکر سے لبریز تھیں۔ اس انہماک میں لوسی کو خوبصورت سفید گھوڑے کی آمد کا اندازہ بھی نہیں ہوا، جو نہ جانے کیسے اپنے کھونٹے سے رسی کھول کر اس کے بازو آ کھڑا ہوا۔ لوسی نے ایک جسم کی گرمی اپنے نزدیک محسوس کی تو مڑ کر سفید گھوڑے کو دیکھا، مگر اپنی مصروفیت میں سوائے ایک تھپتھپی کے توجہ نہ دے سکی۔ دھاری دار گھوڑا تمام رات بارش کے نیچے کیوں کھڑا رہا، اس جگہ سے ہٹ کیوں نہ گیا۔ کہیں بیمار نہ پڑ گیا ہو، پھر یہ سفید گھوڑا کیسے کھل گیا۔ لوسی کے ذہن میں ہزاروں سوال گھوم رہے تھے۔

لوسی نے آج بھی دھاری دار گھوڑے پر سواری کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ 'اسے آرام کی ضرورت ہے' لوسی نے سوچا۔ اس نے سب گھوڑوں کو باہر چراہ گاہ میں چھوڑ دیا اور اپنی سواری کے لیے اسپِ سیاہ کا انتخاب کیا۔ گھوڑی کی دلکی چال دھاری دار گھوڑے سے قدم ملا رہی تھی، یہ جلد ہی سرپٹ ٹاپوں میں بدل گئیں۔ اس جوڑی کے پیچھے دونوں سفید فام گھوڑے بھی دوڑ پڑے۔ بظاہر نئے دھاری دار گھوڑے کو اپنے قبیل میں جگہ مل گئی تھی۔ لوسی نے اطمینان کا سانس لیا۔

گھوڑے دوڑتے ہوئے میلوں نکل گئے۔ دور سے دیکھیں تو لگتا تھا ایک عجیب مسابقت اور رفاقت کا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ دھاری دار گھوڑا اور گھوڑی آگے دوڑے جا رہے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ دھاری دار گھوڑا ان میں سب سے تیز رفتار تھا۔ بے خودی میں آگے بڑھ جاتا تو باقی جانور کوشش کے باوجود برابری نہ کر پاتے۔ خود ہی اپنی رفتار آہستہ کر لیتا کہ گھوڑی اس کے ساتھ

قدم سے قدم ملا لے۔ خوبصورت سفید گھوڑے کی شریانوں میں حسد اور غصے کا آمیزہ اس کی رفتار کو اور ہوا دے رہا تھا۔ وہ موقع کا منتظر رہا۔ اگلے موڑ پر داہنے جانب کھائی تھی۔ اگر میں اچانک بڑھ کر راستہ کاٹ دوں تو یہ دھاری دار اپنی رو میں مڑ نہیں سکے گا۔ نیا جانور علاقے کے جغرافیے سے ناواقف ہے۔ ناواقفیت انجانے خطرات کو جنم دیتی ہے۔ خوبصورت سفید گھوڑا پوری طرح حسد کے شیطانی نرغے میں منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ موڑ اب صاف سامنے نظر آ رہا تھا، اس نے پوری کوشش کر کے رفتار بڑھائی اور دھاری دار کو جا لیا۔ دھاری دار نے دائیں جانب کھائی دیکھی تو بائیں جانب کٹنے کی کوشش کی مگر اچانک ایک خوبصورت سفید جسم حائل تھا۔ دھاری دار کی امید کے برخلاف وہ اسے جگہ دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ رات کو اصطبل کی مار دھاڑ اچانک دھاری دار کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ اسے موت سامنے نظر آنے لگی۔ اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ دائیں جانب کھائی اور بائیں جانب حسد کا پہاڑ۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ دھاری دار اپنی رفتار روک سکتا۔ اچانک پیچھے سے گھوڑی نے اپنا سر سفید گھوڑے کے پیٹ پر ایسا مارا کہ وہ گر پڑا اور دھاری دار کو بچاؤ کا موقع مل گیا۔ گھوڑے اصطبل میں واپس آئے تو ماحول بدل چکا تھا۔ وفاداریاں اور رفاقتیں بدل چکی تھیں۔ لوسی اپنی گھڑ سواری سے واپس آئی تو سب گھوڑے واپس آ کر اصطبل کے باہر گھاس چر رہے تھے۔ اس نے سب کو باری باری ان کے کھونٹوں سے باندھا۔ چھت پر نظر کی تو جارج چھت کا پھٹا حصہ رفو کر چکا تھا۔ لوسی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اصطبل سے باہر جانے سے پہلے خاص طور پر دھاری دار جانور کے پاس گئی، اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ لگتا تھا دھاری دار گھوڑا بارش میں بھیگنے کے باوجود نزلے سے بچ گیا تھا۔ 'کل ضرور اس پر سواری کروں گی' لوسی نے سوچا۔ ویسے تو سفید خوبصورت گھوڑے کی باری تھی لیکن وہ ایک دن انتظار کر سکتا ہے۔ یہ نیا جانور ہے۔ اب ہر گھوڑے کی چوتھے کی بجائے پانچویں دن باری آئے گی۔

اس رات گو آسمان صاف تھا لیکن اصطبل میں شکوک کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ کیونکہ عزائم واضح ہو چکے تھے لہٰذا اچانک اور غیر متوقع اقدام کا وقت جا چکا تھا۔ اس رات اصطبل میں کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔ روز کی طرح لوسی اٹھی، ناشتے سے فارغ ہو کر اصطبل کا رخ کیا۔ خوبصورت سفید گھوڑا آج اس کی باری تھی۔ اسے لوسی کی رفاقت ایک عجیب سرخوشی میں مبتلا

کر دیتی۔ اس کا بس چلتا تو لوسی کا بوجھ پشت پر لادے چلتا ہی رہتا چلتا ہی رہتا۔ آنکھ، کان، جسم کی ہر پور لوسی کے اشارے کی منتظر رہتی۔ لگام کھینچنے، ایڑ لگانے یا چابک استعمال کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ گھوڑا جیسے اپنے سوار کی ہر خواہش بھانپ لیتا تھا۔ گھٹنوں تک چمڑے کے جوتے پہنے، جینز کے پائینچے لوسی نے جوتے کے اندر اڑس لیے تھے۔ قمیض پتلون کے اندر کر کے، ایک چوڑی بکل والی بیلٹ۔ اس کے سنہری بال ایک پونی ٹیل کی صورت میں پیچھے بندھے تھے، اور سر پر ایک کالی ٹوپی الٹی اوڑھ رکھی تھی۔ لوسی اصطبل میں داخل ہوئی تو سفید گھوڑے کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ لوسی اس کے قریب آئی تو اس نے محبت سے اپنا منہ لوسی کے شانے میں گڑو دیا۔ لوسی اس کی گردن تھپک کر دھاری دار گھوڑے کی طرف بڑھ گئی۔ پلٹ کر دیکھتی تو شاید پہلی بار کسی گھوڑے کی آنکھ نم دیکھ لیتی۔ لوسی نے اپنی زین دھاری دار گھوڑے پر کسی، باقی گھوڑوں کو آزاد کر کے اصطبل سے باہر کیا اور خود دھاری دار گھوڑے پر سوار دلکی چال سے اصطبل سے باہر آئی۔ سیاہ فام گھوڑا اور سفید گھوڑا نمبر دو صبح کی تازہ ہوا میں منہ اٹھائے دم بھر میں میلوں کا فاصلہ طے کر کے نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ دھاری دار گھوڑا اپنے مالک کو اپنی رفتار اور طاقت سے مرعوب کرنا چاہتا تھا۔ جیسے بچہ کوئی نئی حکمت، نئی مہارت سیکھ کر ماں باپ کو دکھانے کے لیے بے چین رہتا ہے۔ لوسی کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ جانور اس کے دوسرے گھوڑوں سے کہیں زیادہ تیز رفتار ہے۔ اس نے اپنے سر سے ٹوپی اتار کر جیب میں اڑس لی اور اس کے سنہری بال ہوا میں لہرانے لگے۔ منظر، پھول، سبزہ تیزی سے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ تازہ ہوا اور رفتار نے لوسی کو بہت مزہ دیا۔ اس کا دل مسرت سے بھر گیا۔ ایک موڑ پر پیچھے نگاہ کی تو اسے لگا جیسے خوبصورت سفید گھوڑا بھی پیچھے بھاگا چلا آ رہا ہو، گو صاف ظاہر تھا کہ اسے دھاری دار کے برابر آنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر لوسی نے اپنی ایڑھیاں دھاری دار کے پیٹ میں گڑو دیں، گویا کسی مقابلے میں حصہ لے رہی ہو۔ گھوڑا اپنے سوار کا اشارہ بھانپ کر اور تیز دوڑنے لگا۔ گھوڑی بھی خوبصورت سفید گھوڑے کے دائیں بائیں بھاگ رہی تھی گویا اس پر نظر رکھے ہو۔ سفید گھوڑا اس کے قریب آتا تو رفتار تیز کر کے آگے نکل جاتی، اسے اپنے ساتھ نہ دوڑنے دیتی لیکن اپنی حدِ نظر کے دائرے میں رکھتی۔

سہ پہر سب تھک ہار کر اصطبل کی جانب لوٹے۔ لوسی کو آج بہت مزہ آیا تھا۔ اس نے اتر کر اس کی گردن تھپتھپائی اور ماتھے پر بوسہ دیا۔ باقی گھوڑوں کو کھونٹوں سے باندھا تو آہستہ آہستہ خوبصورت سفید گھوڑا بھی باندھے جانے کے لیے آہستہ چالوں سے آگے بڑھ آیا۔ اس کی چال ہزیمت اور ٹوٹے دل کی چال تھی۔ لوسی نے اس کی لگام تھامی، گردن کی مالش کی اور جا کر اس کے استھان پر کھونٹے سے باندھ دیا۔ اتوار چرچ، آرام اور دوسرے کاموں کے لیے مخصوص تھا۔ آج ہفتہ تھا۔ لوسی سو کر اٹھی تو اس کا دل تو دھاری دار جانور پر سواری کا تھا، مگر اسے اپنے سب گھوڑوں سے محبت تھی، اور وہ سب کو برابری کی ورزش کا موقع دینا چاہتی تھی۔ حسبِ معمول سب گھوڑوں کو اصطبل باہر کرنے کے بعد اس نے خوبصورت سفید گھوڑے کی گردن پر مالش کی، اس کی ایال سنواری، زین کسی اور دلکی چال چلتی اصطبل سے باہر نکلی۔ عموماً خوبصورت سفید گھوڑا، اصطبل سے باہر نکلتے ہی سرپٹ دوڑنے لگتا تھا، لوسی کو اپنا آپ سنبھالنا دشوار ہونے لگتا۔ مگر آج اس کی چال میں وہ زندگی نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے فقط اپنا فرض نبھانے کو دوڑ رہا ہو۔ دل نہ بھی چاہے تو بھی مالک کے حکم سے سرگرانی کہاں ممکن ہے۔ خوراک چاہے گھانس پھونس ہی کیوں نہ ہو، پسینہ بہا کر کمانی پڑتی ہے۔ خوبصورت سفید گھوڑا بھی بے مقصد ایسے ہی دوڑتا رہا۔ لوسی کو آج تک ایڑ نہیں لگانی پڑی تھی۔ لیکن آج ایڑ لگانے پر بھی اس کی چال میں وہ سبک رفتاری نہیں آئی۔۔ جھنجلا کر لوسی نے ہلکے سے اس کی پشت پر چابک ماری۔ چابک ویسے تو لوسی کے ہاتھ میں ہمیشہ رہتی لیکن اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے پچھلی بار کب کسی بھی گھوڑے پر اسے استعمال کیا تھا۔ چابک کھا کر گھوڑا جیسے کسی نیند سے بیدار ہو گیا۔ اس نے یکلخت رفتار پکڑی، اب اس کی دوڑ میں ایک مقصد تھا۔ منہ ہوا میں بلند کر کے اس نے تازہ ہوا سے اپنے پھیپھڑے بھر لیے اور ایک عزم کے ساتھ دوڑنے لگا۔ کھائی والے موڑ پر گھوڑے خود بخود مڑ جاتے تھے، لوسی کو کبھی بائیں لگام کھینچنی نہیں پڑی۔ آج جب لوسی کو لگا گھوڑا مڑ نہیں رہا تو اس نے پوری قوت سے لگام کھینچی لیکن گھوڑا اسی رفتار سے کھائی میں کود گیا۔ اپنی چیخ سے پہلے لوسی کی آخری سوچ یہی تھی کہ شاید اس نے لگام کھینچنے میں بہت دیر کر دی۔

چشمِ حیراں

میرا خارجی منظر ایک انجماد کا شکار ہے۔ عکس کا تعلق منظر، عدسے اور فلم سے ہوتا ہے۔ اب یہاں عدسہ یا فلم تو تبدیل ہونے سے رہے، صرف منظر ہی بدل سکتا ہے، اور وہ برسوں سے انجماد کا شکار ہے۔ اس کا کچھ قصور شاید اس کھڑکی سے میرا عشق ہے، جس کے پیچھے بیٹھ کر میں سارا دن گزار دیتا ہوں۔ نہ تھکن کا احساس ہوتا ہے، نہ تیزی سے گزرتے وقت کا۔ احساسِ زیاں کے لیے لازم ہے کہ پہلے آپ کو سرمائے کی قدر و قیمت کا احساس ہو۔ وقت چونکہ بظاہر بہتات میں ہے اس لیے ملکیت کا فریب رہتا ہے۔ افسوس صرف یہ ہے کہ یہ کھڑکی لکڑی کی بنی ہوئی ہے۔ عمر کے ساتھ، ساتھ دھوپ، بارش اور موسم کی سختیوں سے لکڑی سال خوردہ ہوتی جا رہی ہے۔ وہ تو شکر ہے اس کے دونوں پٹ باہر کی جانب کھلتے ہیں، اندر کی جانب کھلیں تو کیسا برہنگی کا احساس ہو۔ میرے بس میں ہو تو ایک آہنی خوش نما فریم کی کٹاؤ کے کام کی کھڑکی بنواؤں۔ اس میں ایک مچھر دانی جیسی جالی تان دوں کہ صرف اپنی مرضی کے مناظر چھن چھن کر اندر آسکیں۔ نظارے یا احساس کو چاہے اس کھڑکی سے باہر رکھو، اور چاہو تو دھوپ کے ایک مستطیل ٹکڑے کی مانند اس کھڑکی سے اند بلالو اور حسن نظارہ کو تمازت سے سرشار رکھو۔ یہ کاری گر کبھی کام پورا کیوں نہیں کرتے، خیر اب مکان کی تعمیر کے بعد معمار سے کیا لڑنا۔

اس بار مارچ میں جب میں پاکستان گیا تو شاید یہ منظر کی تبدیلی کی ایک کاوش تھی۔ پاکستان میں اب صرف دو منظر ہوتے ہیں؛قتل و غارت گری کا منظر یا کرپشن کا منظر۔ باقی سارے حسن کو حکمرانوں کی ہوسِ طلب بہا لے گئی یا مذہبی انتہا پسندوں کی تنگ نظری۔ اس پس منظر میں ایک دن جوڑیا بازار میں گھوم رہا تھا۔ ایک کباڑئے کی دکان پر ایک بہت پرانی فلم بین دکھائی دی۔ میری عمر کے لوگوں کو یاد ہوگا کہ یہ پہیے کی شکل کا ایک دوربین نما آلہ ہے۔ اسے آنکھوں کے سامنے جمالیں اور پھر ایک ہاتھ سے پہیہ گھماتے جائیں، اس کا فریم بدلے گا ساتھ ساتھ منظر بدلتے جائیں گے۔ پاکستان جاؤں تو کباڑیے کے ہاں ضرور جاتا ہوں۔ اپنی کھوئی ہوئی عظمت کی نشانیاں آپ کو کباڑیے کے ہاں جا بجا بکھری ملیں گی۔ اس پر طرہ یہ کہ کوڑیوں کے مول دستیاب ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ اس دام بھی کوئی ان کا مول دینے کو تیار نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی بھگوڑا سپاہی کسی پچھلی جنگ کا تمغہ مانگ کے سینے پر سجا کر ایک چھوٹی خوشی ادھار لے لیتا ہے۔ میں ایک بھگوڑا تارک الوطن، اپنے تمغوں کی تلاش میں کباڑئے کی دکانیں کریدا کرتا ہوں۔

میری دلچسپی دیکھ کر کباڑیے نے اس کے اوصاف بیان کرنے شروع کر دیے:

'ارے صاحب یہ بہادر شاہ ظفر کے ایک کاری گر نے واسرائے کی بیوی کے لیے تیار کیا تھا۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اسے آنکھوں کے سامنے رکھو تو منظر ہوگا کچھ لیکن آپ کو نظر آئے گا کچھ اور۔ یہی خود بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ہوا۔ منظر تھا کچھ اور انھیں کچھ اور نظر آتا رہا۔ یہ فلم بین آنکھوں کے سامنے سے ہٹانا بھول گئے۔ صرف خرابی یہ ہے کہ ایک دن میں آپ کو یہ صرف ایک ہی منظر دکھاتی ہے، چاہے آپ کتنی ہی بار اسے نگاہوں کے سامنے جمالیں۔ دوسرے منظر کے لیے نئے سورج کا انتظار کرنا پڑے گا۔ لوگ بور ہو جاتے ہیں۔ مگر آپ بہت قدردان معلوم ہوتے ہیں، بہت مناسب قیمت لگا دوں گا۔'

نہ جانے کیا سوچ کر میں اس کی باتوں میں آ گیا۔ ایک تو ڈالر جیب میں رکھ کر پاکستان جاؤ تو لگتا ہے جیب میں ڈالر کھلنے لگتے ہیں۔ خرچ ہونے کو بے چین۔ کئی ایسی چیزیں ساتھ آجاتی ہیں کہ بعد میں قلق ہو وہیں چھوڑ آتے تو اچھا تھا۔ خیر یہ ایک علیحدہ قصہ ہے پھر کبھی۔ اب

یہ فلم بین آلہ میں نے خرید تو لیا، لیکن گھر آ کر سوٹ کیس میں بند کر دیا۔ سوچا نیو یارک میں جب منظر کی یکسانیت بہت تنگ کرے گی تو روز اس سے ایک نیا منظر تراشوں گا۔

آج پیر کا دن ہے، نیو یارک کی جنوری کی ایک بہت سرد اور برفیلی صبح ہے۔ میں چائے کا کپ لیے کھڑکی سے نظارے اندر آنے دے رہا ہوں۔ ہرے بھرے باغ پر دور تک سفید دودھیا برف کی چادر بچھی ہے۔ برف کی سفیدی سے منعکس ہونے والی سورج کی کرنیں کس قدر سکون دے رہی ہیں۔ دھوپ اور برف زیادہ دیر ایک دوسرے کی قربت برداشت نہیں کر سکتے۔ ایک کی شدت دوسرے کو مارے رکھتی ہے۔ جب تک میانہ روی رہے، دونوں کا سنگم ماحول کو بہت فرحت انگیز اور حسین بنائے رکھتا ہے۔ اس وقت بھی ایسا ہی تھا۔ ٹھنڈ کی شدت دھوپ کی حدت کو مار رہی تھی۔ میرے جی میں کیا آیا، اپنی فلم بین اٹھا لایا اور آنکھوں کے سامنے رکھ دی۔ کیا دیکھتا ہوں کھڑکی کے سامنے فٹ پاتھ پر ایک گلہری دانا دنکا نگل رہی ہے۔ عموماً اس موسم میں گلہریاں اپنی کھوہ میں آرام کرتی ہیں۔ خزاں اور اول سردی میں قسم قسم کے مغزیات اور دوسری خوراک جمع کر کے سخت موسم کی آمد سے پہلے گلہری کے ہاں اناج ذخیرہ ہو چکا ہوتا ہے۔ یا تو اس گلہری کے ذخیرے کا اندازہ غلط تھا یا یہ گلہری ہوس میں زیادہ کھا بیٹھی تھی اور اب انجام بھگت رہی تھی کہ اس برفانی صبح غذا کی تلاش میں بھٹک رہی تھی۔ جس درخت سے یہ گلہری اتری تھی وہ اس وقت ٹنڈ منڈ کھڑا تھا اور ساری سردیاں ایسے ہی ننگے سر کھڑا رہتا۔ یہ بھی قدرت کا عجیب کھیل ہے آپ امید کریں گے کہ سردیوں میں درختوں کو سردی سے بچاؤ کی خاطر پتوں کے لحاف کی ضرورت ہوگی۔ مگر قدرت ان پر سے لحاف کھینچ کر درختوں کو بے سر و سامان کر دیتی ہے۔ اسی درخت کے نیچے ایک موٹر سائیکل سوار ہاتھ پر چمڑے کے دستانے چڑھائے، کالی جیکٹ پہنے جس کی زپ سامنے سے اوپر تک بندھی تھی، جیکٹ کے کالر بھی کھڑے ہیں کہ جتنا ممکن ہو سردی کو روک لے، موٹر سائیکل اسٹارٹ کیے کسی کے انتظار میں کھڑا تھا۔ ایک پیر زمین پر اور ایک پائیدان پر۔ سردی اتنی شدید کہ منہ سے نکلی سانس بھی باہر آ کر جم جاتی تھی۔ ایسے میں وہ اضطراری طور پر موٹر سائیکل کا ایکسلیٹر گھمائے جا رہا تھا۔ جہاں اس کی آواز ماحول کا سناٹا توڑ رہی تھی وہیں سائیلنسر سے دھواں نکل کر سرد ماحول میں اپنی گرمائش کھو رہا تھا۔ میں بہت دیر تک دلچسپی سے اس گلہری کو دیکھتا رہا جو

موٹر سائیکل کے پاس پڑے کسی اخروٹ کی تاڑ میں تھی۔ گلہری جب بھی ذرا آگے بڑھتی، اتفاقاً اسی وقت موٹر سائیکل کی آواز بڑھ جاتی جس سے وہ ڈر کر پیچھے ہٹ جاتی۔ وہ نو جوان اس بات سے بالکل بے خبر تھا کہ اس کی بے ضرر بے چینی کسی کو اس کی خوراک سے محروم کر رہی ہے۔ سچ یہ ہے کہ بظاہر بے ضرر اور سادے سے عمل کے ایسے اثرات ہو سکتے ہیں جو دوسروں کے لیے زیادہ اہم ہوں۔ گلہری نے بھی ہمت نہ ہاری، غالباً سترھویں حملے سے ذرا پہلے وہ نوجوان موٹر سائیکل آگے بڑھا لے گیا، اور گلہری کو اپنی مستقل مزاجی کا پھل مل گیا۔ گلہری کی استقامت اور حکمتِ عملی ہر دفعہ وہی تھی لیکن قدرت نے ایسی رکاوٹیں کھڑی کر رکھی تھیں جن کے ہٹے بغیر یہ مرحلہ دشوار تھا۔ میں کھڑکی سے ہٹ آیا۔ سارا دن وہ دوربین تماشے لگا لگا کر دیکھتا رہا، مگر ہر بار وہی ایک منظر سامنے آجاتا۔ میرے ذہن میں دکاندار کا وہ فقرہ گونجا کہ اس کی خرابی یہی ہے کہ سارے دن میں بس ایک ہی منظر دکھاتی ہے۔

منگل کی شام میں کام سے جلدی لوٹ آیا۔ ذرا ستا کے بیٹھا تھا کہ اپنی فلم بین کا خیال آیا۔ آنکھوں کے سامنے لگا کر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ شام کے سائے لمبے ہو رہے ہیں اور دونوں وقت ملنے کو ہیں۔ اس وقت کھڑکی سے جھگی کے باہر کا نظارہ دکھائی دے رہا ہے۔ سامنے ایک رہٹ اور کنواں ہے۔ سیدھے کھڑے ہو کر دیکھنے سے کنویں کی صرف منڈیر نظر آرہی ہے۔ اس کے اندر کا نظارہ کرنے کے لیے مجھے اپنے پنجوں کے بل اچک کر تقریباً آدھا باہر لٹکنا پڑا۔ ایک ہاتھ سے فلم بین آنکھوں کے سامنے لگائے دوسرے ہاتھ سے اپنا توازن قائم رکھنے میں مضحکہ خیز لگ رہا ہوں گا۔ مگر حدِ نظر کے پار کا نظارہ کرنے کے لیے بعض دفعہ آدمی کو مضحکہ خیز طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں، پنجوں کے بل اٹھنا پڑتا ہے۔ لمبے قد سے یہ فائدہ ہوا کہ مجھے کنویں کی تہہ میں پانی اور تین ٹانگ کا ایک مینڈک تک نظر آ گیا۔ یہ مینڈک غالباً اسی کنویں کی پیداوار ہے اور یہیں اپنے دن پورے کر کے ختم بھی ہو جائے گا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کنویں میں اور کوئی مینڈک نہیں ہے تو پھر یہ کہاں سے آ گیا۔ شاید باہر سے جھانک رہا ہو اور کنویں میں گر پڑا ہو۔ اکثر بلا ضرورت تانک جھانک ایسی ہی مشکلوں سے دوچار کر دیتی ہے۔ بھئی راستے میں کنواں پڑا بھی تھا تو چکر کاٹ کر دوسری طرف پھدک جاتا، بلا وجہ

منڈیر سے نیچے جھانکنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب تجسس کی سزا بھگت رہا ہے۔ تجسس کی سزا کالا کنواں ایک پرانی رومانوی داستان ہے۔ مگر میرے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ یہ کہاں سے آیا ہے ہوسکتا ہے اسی کنویں کی پیداوار ہو؟

ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ایک اور مینڈک کنویں کی منڈیر پر آبیٹھا۔ واہ بھئی یہ فلم بین بھی خوب تماشے دکھا رہی ہے۔ کنویں کے اندر بیٹھے مینڈک نے جو منڈیر کے مینڈک کو دیکھا تو اس سے چپ نہ رہا گیا:

'کیسے ہو بھیا یہ تمھاری ایک ٹانگ کیسے کٹ گئی؟'

'دونوں ٹانگیں سلامت تو ہیں میری. کیا پوچھ رہے ہو۔'

'ہاہا' کنویں کا مینڈک ہنس دیا۔' مینڈک کی تو تین ٹانگیں ہوتی ہیں۔ دیکھ لو میری تینوں ٹانگیں سلامت ہیں۔'

'باؤلے ہوئے ہو سارے مینڈک دو ٹانگوں کے ہوتے ہیں، تمھاری ایک ٹانگ زیادہ ہے۔'

'اپنی کمی کو مجھ پر تھوپ رہے ہو۔ بہت تیز مینڈک ہو بھئی۔ خیر چھوڑو اس بحث کو، کہو آج چاند نہیں نکلا؟'

'نکلا تو ہے مگر شرقی افق پر ہے۔'

'شرقی افق؟ یہ کیا بلا ہے۔ سیدھا سادھا گول تین گز قطر کا آسمان ہے، اس میں شرقی غربی کیا کر رہے ہو، اور نکلتا تو کیا مجھے نظر نہیں آتا؟' کنویں کے مینڈک کو یہ باہر منڈیر پر بیٹھا مینڈک بہت جھوٹا، چالاک اور مکار لگا۔

'نہیں میاں، آسمان تو بہت وسیع اور عظیم ہے۔ ہر سمت میں حدِ نظر تک پھیلا ہے۔ تمھارا مسئلہ یہ ہے کہ تم نے صرف کنویں کے اوپر کا آسمان دیکھا ہے۔ ورنہ آسمان تو کھیت، کھلیان، صحرا، پہاڑ سب پر ایک چھتری کی طرح تنا ہوا ہے۔'

'کھیت، کھلیان، صحرا، پہاڑ یہ کیسی افلاطونی گپ ہانک رہے ہو؟'

'تم سے گفتگو بیکار ہے۔' منڈیر پر بیٹھے مینڈک نے سرد آہ بھری اور پھدک کر میری فلم بین کے فریم سے باہر ہو گیا۔ پنجوں پر کھڑے کھڑے میں بھی تھک گیا تھا۔ اور پھر کھڑکی سے

آدھا لٹک کر آپ کسی چیز کا کتنی دیر تک نظارہ کر سکتے ہیں بھلا۔ وہ بھی جب گفتگو دو منٹوں میں ہو۔ میں نے دونوں پیروں پر برابر وزن ڈالا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ دونوں پیروں پر برابر کا وزن ڈالیں تو زیادہ عرصے سیدھے کھڑے رہ سکتے ہیں، آزما کر دیکھ لیجیے۔

اب تو مجھے اس فلم بین سے ایسا لطف آنے لگا تھا کہ بدھ کو تو میں کام سے جلدی چلا آیا، دیکھیں آج کیا ماجرا دیکھنے کو ملتا ہے۔ اب جو فلم بین آنکھوں کے سامنے لگا کر کھڑا ہوا تو لگا پھر وہی کل جیسا منظر ہے۔ یہ بھلا کیسے ممکن ہے۔ اس میں تو روز نیا منظر نظر آتا تھا۔ میں نے فلم بین آنکھوں سے ہٹا کر عدسوں پر پھونک ماری، پھر کرتے کے دامن سے ذرا شیشے صاف کیے۔ دوبارہ آنکھوں کے سامنے رکھا۔ آہا، پس منظر تو شاید کل سے ملتا جلتا تھا۔ لیکن بعض اوقات چھوٹی دلچسپیاں ایسی آپ کی توجہ کھینچ لیتی ہیں کہ سامنے کی بڑی اور واضح تصویر نظر نہیں آتی۔ کنواں تو شاید کل والا ہی تھا لیکن آج ایک رہٹ اور اس میں جتا بیل فوکس میں تھا۔ کیا دیکھتا ہوں ایک بیل جس کا سینہ رسوں کی مدد سے ایک لکڑی کے بانس نما تختے سے بندھا ہے۔ بیل کنویں کے چاروں طرف گول گول چکر لگا رہا ہے۔ جب تک اس کا پالنے والا اور رکھوالا اسے کھول نہیں دے گا یہ اسی طرح بہ ظاہر بے مقصد ایک دائرے میں گھومتا رہے گا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس بے مقصد طواف سے خلقِ خدا کے لیے پانی اوپر کھینچ رہا ہے۔ خود بیل اپنی اس افادیت سے بے خبر ہے۔ یہ لاعلمی بھی رکھوالے کے مفاد میں ہے۔ بیل کو اپنی افادیت کا علم ہو جائے تو حساب کتاب، معاوضے، انعام اور حقوق کی دھند میں افادیت کے خدوخال مدھم پڑ جائیں۔ بہت سے مالک ان الجھنوں میں پڑنے سے بہتر سمجھتے ہیں کہ آنکھوں پر موم ٹپکا کر کام نکال لیں۔ پھر یہ طرزِ عمل صرف افراد تک ہی محدود نہیں، بین الاقوامی تعلقات بھی اس آئین کے پابند ہیں۔ بلکہ اگر غور کریں تو شاید خالقِ اعظم بھی اسی طرزِ عمل کا مجرم ہے، موم ٹپکا کر زمین پر پٹخ دیا اب ٹٹولتے پھرو۔ رہٹ اور بیل کے منظر میں اتنی یکسانیت تھی کہ میں بہت بور ہو گیا۔ فلم بین کو بند کر کے جیب میں رکھا اور چہل قدمی کو باہر نکل گیا۔

جمعرات کا منظر زیادہ خوش کن تھا۔ واقعی حیرت کی بات ہے کہ اسی کھڑکی سے کیسے قسم قسم کے مناظر نظر آرہے تھے۔ کھڑکی کے دونوں پٹ وا کر کے فلم بین آنکھوں سے لگائی تو کتوں کا

ایک ریس کورس سامنے تھا۔ نزدیک و دور سے شوقین مزاج امراء، شاطر اور دوسرے تماش بین، کتوں کی دوڑ دیکھنے اور ان پر شرط بدنے کو چلے آرہے ہیں۔ امراء کے لیے تو یہ کھیل ہی کے زمرے میں آئے گا۔ پیسے کی فراوانی ہو تو اسے نت نئے طریقوں سے جوش، جذبہ، لطف اور ہیجان حاصل کرنے کے لیے صرف کیا جاتا ہے۔ جیت سے بڑھ کر خوشی اور ہیجان کیا ہو سکتا ہے۔ کچھ ذرا کم خوش قسمت شائقین بھی اپنے کپڑوں کی تراش خراش سے پہچانے جارہے ہیں۔ یہ اپنے بخت کے ستارے کتوں کی دوڑ سے چمکانے کی امید میں آئے ہیں۔غرض یہ کہ انواع و اقسام کے شرکاء مختلف امیدوں اور امنگوں کے ساتھ دمکتے چہروں سے آرہے ہیں، لیکن بیشتر منہ لٹکائے واپس جائیں گے۔ پتلی کمر اور مضبوط ٹانگوں والے دو درجن کتے، ایک کاغذی خرگوش کے تعاقب میں سردھڑ کی بازی لگائے بھاگے چلے جارہے ہیں۔ لالچ ان کو بھگائے لیے جارہی ہے۔ ایک دوسرے سے سبقت کی جدوجہد کہ کوئی ان سے پہلے پہنچ گیا تو وہ خرگوش ہاتھ سے نہ جاتا رہے۔ ذرا دم لے کر غور کر لیتے تو اس مشقت سے نہ صرف بچ جاتے بلکہ دوسرے کتوں پر ہنسنے کا موقع بھی مل جاتا۔ لیکن کم از کم اس کھڑکی سے ایسا کوئی کتا نظر نہ آیا جو صبر کے ساتھ رک کر، دوڑنے سے پہلے خرگوش کے بارے میں کچھ سوچ رہا ہو۔ ہر کتے کو خانہ کھلتے ہی خرگوش کے پیچھے سرپٹ دوڑتے دیکھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے جمعہ آگیا۔ اسلامی جمہوریہ میں آج آدھے دن کی چھٹی ہے۔ ہم نماز نہ بھی پڑھیں لیکن چھٹی سے کفرانِ نعمت نہیں۔ چند گھنٹے کا کام ہی کیا اور وہ بھی اسلامی جمہوریہ میں۔ بھئی ابھی تو دفتر آئے ہیں، کچھ سانس درست ہولے تو کام شروع کریں۔ لیجیے شروع کرنے سے پہلے سمیٹنے کا وقت آگیا۔ جمعے کا دن ہے، نہانا دھونا بھی ہے، ایسا نہ ہو نماز میں دیر ہو جائے۔ بس اب یہ کام سمیٹ کر رکھ دو پھر کریں گے، جتنی دیر میں میرا لپٹا ہوا بستر کھلا۔ لعنت ہو اس فلم بین پر، ایسا چسکا پڑا تھا کہ گھر جاتے ہی کچھ دیر میں یہ آنکھوں کے سامنے لگی ہوئی تھی۔ جمعے کو کیوں استثنا ہوتا۔ آنکھوں سے یہ عدسہ لگایا تو آج کھڑکی سے امارات کا منظر نظر آرہا ہے۔ جمعے کی تعطیل ہے۔ نماز کا وقت ختم ہو چکا ہے، سہ پہر سورج ڈھلنے سے پہلے کا منظر ہے، تمازت خاصی کم ہو چکی ہے۔ ماشاء اللہ لوگ جوق در جوق اونٹوں کی سیر کے لیے جارہے ہیں۔

عبادت سے فارغ ہو کر اب مخلوقِ خدا کچھ کھیل کھلواڑ کی بھی حقدار ہے۔ میدان میں وہی کتوں کی دوڑ والا منظر ہے۔ لیکن یہاں عرب شیوخ بہترین کاٹن کی عبا چغا پہنے، قیمتی دھوپ کی عینکیں ناک کی پھننگ پر اٹکائے، اونٹ دوڑ کے میدان کی طرف گامزن ہیں۔ گاڑیاں نئی اور کشادہ ہیں، اکثر گاڑیوں کا مربعہ ان کے ڈرائیوروں کے کمرے سے بیش ہے۔ اونٹ دوڑانے والے اکثر خارجی ہیں۔ زیادہ تعداد یمن کے غریب باشندوں کی ہے جو اونٹوں کی نکیل پکڑے آگے آگے ہیں۔ اونٹ دوڑ شروع ہو چکی ہے، اونٹوں کی پیٹھ پر شاید گڈے گڑیا باندھ دیے گئے ہیں کہ دیکھنے میں خوشنما لگیں۔ لیکن ٹھہریے اونٹوں نے رفتار پکڑ لی تو یہ گڈے گڑیا دہشت سے چیخ رہے ہیں۔ یہ چیخیں اونٹوں کے لیے چابک کا کام دے رہی ہیں، اونٹ بھڑک کر اور تیز بھاگ رہے ہیں۔ پویلین میں بیٹھے شیوخ اب ہاتھوں میں شربت کے گلاس لیے کھڑے ہو گئے ہیں اور مسرت سے چیخ رہے ہیں۔ دوربینیں ہاتھوں میں ہیں۔ ان کا اونٹ آگے نکل جائے تو چہرے پر فخر و غرور کی قوس و قزح بکھر جائے۔ جو بچے اونٹوں سے باندھ دئے گئے ہیں ان کی اوسط عمر چھ سال ہے۔ ایک اونٹ کی پشت پر بندھی رسی ڈھیلی ہوئی تو بچہ زمین پر ٹپک گیا۔ میں نے فلم بیں آنکھوں کے سامنے سے ہٹا لیا۔ مزید دیکھنا میرے شعور کی برداشت سے باہر ہے۔ غنیمت ہے اور خوش قسمت ہیں جانور کہ وہ بھوک و افلاس سے مجبور ہو کر، اپنے بچوں کی جان امارات کی شریانوں میں دورانِ خون بڑھانے پر قربان نہیں کرتے۔ مجھے فلم بین سے ایسی نفرت ہوئی کہ اسے لا کر میز پر پٹخ دیا۔ کیسا اچھا دن گزر رہا تھا۔ اس کثافت نے ایمان و ایقان کی جڑیں ہلا دیں۔ یہ منظر تو شاید مرتے دم تک میرے لاشعور میں ایک ایسا بیک گراؤنڈ بن گیا ہے، جیسے کوئی کمپیوٹر کھولو تو شروع میں اسکرین پر ایک بیک گراؤنڈ تصویر ابھرا کرتی ہے، اس کے بغیر کمپیوٹر استعمال کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ لاعلمی روح کو کتنے دکھوں سے محفوظ رکھتی ہے، مجھے مشرق کے بارے میں کپلنگ کے فرمودات کچوکے لگانے لگتے ہیں۔

آج سنیچر کا دن ہے۔ اسلامی مملکت میں پھر نصف چھٹی ہے۔ کل سوچا تھا اب فلم بین نہیں دیکھوں گا۔ ان پانچ دنوں میں پانچ مناظر نے میری دنیا تہہ و بالا کر دی تھی۔ اب میں منہ پر چادر ڈال کر سونے لگا تھا۔ مگر خیالات کی یلغار اس چادر کے پردے کو کسی خاطر میں نہ لاتی۔

بھئی آپ سگریٹ بھی تو پیتے ہیں، معلوم ہے مضر صحت ہے مگر پھر بھی پیتے ہیں۔ بس یوں سمجھ لیجیے اسی قسم کا چسکہ اس فلم بین نے پیدا کر دیا تھا۔ آنکھ کے آگے فلم بین کا عدسہ رکھ کر کھڑکی پر جا کھڑا ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جنگل کے عین وسط میں ایک میدان دھرا ہے، جس میں درخت تو کیا گھاس پوس کی روئیدگی بھی نہیں۔ چاروں طرف سے جانور آ آ کر جمع ہو رہے ہیں۔ پچھلی قطار میں کچھ شیر بھی سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ کچھ چیتے اور شیر اِدھر اُدھر قیلولے میں مصروف ہیں، کچھ کے سامنے ہرن اور بکری کے گوشت کے انبار لگے ہیں۔ وہ اس گوشت خوری میں ایسے مصروف ہیں کہ سر اٹھا کر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں۔ سب سے اگلی قطار میں لکڑ بگھے، بجو، لومڑ اور اس قبیل کے کئی جانور نشست سنبھالے بیٹھے ہیں۔ سب سے اگلی اور آخری قطار کے درمیان ہرن، نیل کنٹھ، ہاتھی، گائے، زیبرا اور بندر وغیرہ غرض قسم قسم کے جانور بھیڑ لگائے ہوئے ہیں۔ اچک اچک کر یہ جانور آگے اسٹیج کو دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں جہاں ایک گیدڑ اس مجمعے سے خطاب کر رہا ہے:

'میرے عزیز ہم وطنو! کل رات کی تاریکی میں نوزائیدہ جمہوریت کا دم گھٹنے سے انتقال ہو گیا۔ نئی دستور ساز اسمبلی کا اجلاس آج شام چھ بجے طلب کیا گیا ہے، اور'

اس سے پہلے کہ بات مکمل ہوتی، حسبِ عادت بندر بیچ میں بول پڑا:

'شیر ببر کا کیا ہوا، یہ کیسے ممکن ہے؟'

'نظریۂ ضرورت' گیدڑ نے مسکرا کے کہا، اور اس کی ایک آنکھ کے اشارے پر چند چھوٹے گیدڑ آگے بڑھے اور ڈنڈا ڈولی کر کے چیختے چلاتے بندر کو اٹھا لے گئے۔

شیر نے اس شور شرابے سے نظر اٹھائی تھی تو ایک گیدڑ نے اس کے آگے ایک تازہ بکری ڈال دی۔

'میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں،' گیدڑ کی تقریر جاری تھی کہ میری سماعت دہشت زدہ ہو کر جواب دے گئی اور میں کھڑکی سے پیچھے ہٹ آیا۔ باقی سارا دن میں نے بی بی سی کے آگے بیٹھ کر اور ناہید اختر کے گیتوں کے درمیاں کہیں گزار دیا۔

آج میرا پسندیدہ دن ہے، اتوار کا دن۔ کون کہتا ہے مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب،

اور دونوں کبھی نہیں مل سکتے۔ اتوار کے دن یہ دونوں ملتے ہیں۔ گرجے تو خیر سے بند کرا دیے ایمان کی حرارت والوں نے لیکن اتوار کی چھٹی نہ بند کرا سکے۔ لہٰذا اتوار کا دن لمبی تان کر سونے اور گیارہ بجے اٹھنے کا دن ہے۔ تین بجے دوپہر تک نائیٹ سوٹ میں ملبوس گڈ مارننگ پاکستان شو دیکھنے کا نام اتوار عیاشی ہے۔ ایسے میں عدسے کی باری آتے آتے دو پہر ہو گئی۔ اتوار کی اس خوبصورت دوپہر، ٹی وی کا کان مروڑ کر اسے بند کیا اور شاور کا رخ کیا۔ نہا کر ڈھیلے ڈھالے باتھنگ گاؤن میں ہی نکل آیا۔ پاؤں میں سلیپر اٹکائے اور پھر وہی کھڑکی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ابھی عدسہ آنکھ پر رکھا بھی نہیں تھا کہ سامنے ایک درخت پر بندر بیٹھا نظر آیا۔ میں نے جھٹ سے فلم بین آنکھوں پر لگائی مگر تب بھی وہی منظر نظر آیا، کہ ایک بندر سامنے درخت پر بیٹھا کھیسیں نکال رہا ہے۔ ایک ہاتھ میں کیلا ہے، دوسرے سے وہ مجھے انگوٹھا دکھا رہا ہے۔ مجھے دو تین مرتبہ حیرت سے عدسہ لگاتے، ہٹاتے دیکھا تو بولا:

اپنا عکس دیکھنے کے لیے عدسے کی ضرورت نہیں ہے'۔ شاید بندر پن دکھانا ضروری تھا۔ ایک چھلانگ مار کر کھڑکی کی منڈیر پر آبیٹھا۔ میں ڈر کر ذرا پیچھے ہو گیا۔

'اپنوں سے کیا ڈر' کسی بندر کے اس قسم کے احمقانہ جملوں کا کوئی کیا جواب دے۔

'اے احمق انسان، ان مناظر کو دیکھنے کے لیے تجھے کیا واقعی اس عدسے کی ضرورت تھی؟' مجھے لگا جیسے بندر میری ہی آواز میں مجھ سے مخاطب ہے۔ 'سب دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہ دیکھنا چاہو تو یہ عدسہ بھی بیکار ہے، یہ کیلا لے لو عدسہ مجھے دے دو۔'

میں گنگ تھا، بے اختیار اپنی فلم بین پشت کی طرف کر لی۔

'یہ عدسہ تمھیں تپ دق کر دے گا، لاؤ مجھے دے دو' بندر بچوں کی طرح مجھے پھسلا رہا تھا، سمجھا رہا تھا۔

'تم تو ہمیشہ کھلونے دے کے بہلائے گئے ہو، چلو یہ بھی رکھ لو۔ ہم تو تمھارے بھلے کو کہہ رہے تھے، آگہی کے عذاب سے بچ جاتے، خیر تم ہی جانو' یہ کہہ کر بندر چھلاوے کی طرح درختوں کے بیچ غائب ہو گیا۔ میں نے اس عدسی فلم بیں کو، اپنی پائیں باغ میں نیم کے درخت کے پاس ایسے دفن کر دیا ہے کہ پھر میرے اندھے پن کو بینائی دینے کی جسارت نہ کر سکے۔

چور

بیچ رات میں بلا سبب آنکھ کھل گئی۔ دل اس قدر زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ کسی وقت بھی اس گوشت و ہڈی کے پنجرے کو توڑ کر باہر آجائے۔ میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری، اور اندازہ لگانے لگا کہ آنکھ کیوں کھلی ہے۔ شاید کوئی کھٹکا ہوا تھا؟ میں دم سادھے ایک دم سوتا بن گیا۔ ہر مسامِ جاں صوتی اینٹینا بن گیا۔ مگر صرف وہی رات کا مہیب سناٹا تھا۔ کہیں سے جھینگروں کی آواز آرہی تھی۔ رات کی تاریکی کا اپنا ایک مخصوص سناٹا ہوتا ہے۔ آپ کبھی غور کیجیے گا، صرف یہی نہیں کہ زندگی قیلولے میں چلی گئی ہے اور سب آوازیں اور آوازیں بلند کرنے والے کچھ دیر کے لیے سو گئے ہیں، اس لیے سناٹا ہے، بلکہ رات کے سناٹے کی اپنی ایک آواز ہے، خامشی سے بالکل علیحدہ۔ خیر چند لمحے اندازہ لگانے کے بعد میں مطمئن ہوگیا اور یہ وسوسہ دل سے نکال دیا۔ پھر کیوں آنکھ کھل گئی ہے؟ ایسا یقیناً آپ کے ساتھ بھی کئی مرتبہ ہوا ہوگا۔ بلاوجہ بیچ رات میں آنکھ کھل جائے، پھر گھنٹوں آپ سونے کی شعوری کوشش کریں، کروٹیں بدلیں، تمام مروجہ ٹوٹکے برتے لیں۔ آنکھ بند کرکے ایک قطار میں فرضی بھیڑیں گننا، یا سو سے الٹی گنتی گننا۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ جتنا زیادہ آپ شعوری کوشش کریں اتنا ہی نیند آپ سے بھاگتی ہے۔ پھر عین اس وقت جب آپ کو الٹی گنتی سے نفرت ہونے لگے اور آپ نیند پر لعنت بھیج چکے

ہوں، دفتر جانے میں صرف ایک یا دو گھنٹے رہ گئے ہوں، نیند کی دیوی اچانک کہیں سے پھر نمودار ہو جاتی ہے۔

'کھٹ' کی آواز اب کے واضح تھی۔ میرا پہلا ردِعمل تو یہی تھا کہ چادر سر کے اوپر لے لو، گویا آنکھ اوجھل خطرہ اوجھل۔ میرے خیال میں ڈارون کو ہمارا رشتہ بندر کے بجائے سارس سے جوڑنا چاہیے۔ اس آواز کے بعد پھر وہی مہیب سناٹا۔ مگر میرے ذہن میں اب کوئی شبہ باقی نہیں رہا تھا۔ آواز نچلی منزل سے آئی تھی۔ ہم تین کمروں کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ رہائشی کمرے اوپر کی منزل پر تھے۔ گول کمرہ، کھانے کا کمرہ اور باورچی خانہ نیچے کی منزل پر۔ گھر میں داخل ہوتے ہی سیدھے ہاتھ پر ایک چھوٹا کمرہ مہمانوں کے لیے مخصوص تھا، جو سال کے بیشتر وقت خالی رہتا۔ کوئی بھولا بسرا مہمان راستہ بھٹک کر آ بھی جائے، اور اس پر طرہ یہ کہ رات گزارنے کے لیے ٹھہر بھی جائے، تو بھی ہم اسے بہلا پھسلا کر اوپر کے کمرے میں سلا لیتے ہیں۔ صرف ایک بیٹا تھا وہ حصولِ علم کی خاطر ہاسٹل میں قیام پذیر تھا۔ گھر میں پچھلے رخ پر باورچی خانہ تھا جس کے پیچھے چھوٹا سا باغ۔ پیچھے باورچی خانے سے دو فرنچ نسل کے دروازے باہر باغیچے میں کھلتے تھے۔ یوں تو یہ دروازے بہت کارآمد ہوتے ہیں، دونوں در پاٹو پاٹ کھل جاتے ہیں۔ بڑے اسکرین کے ٹی وی سے لے کر صاحبِ خانہ کی میت تک گزار لیجیے۔ یہ اور بات ہے کہ ٹی وی عموماً اندر کی جانب آرہا ہوتا ہے جبکہ چارپائی باہر کی طرف نکلتی ہے۔ مگر یہی بڑا دروازہ کسی فاحشہ کے چوبارے کی طرح دعوتِ وصل بھی دے رہا ہے۔ میں نے اس فرنچ دروازے کو ہمیشہ اپنے قلعہ کی کمزور فصیل سمجھا ہے۔ لگتا ہے آج کوئی اس فصیل کو پھلانگ کر کود آیا ہے۔

'شاید کوئی بلی ہے' میں نے اپنے آپ کو تسلی دی۔ اگر بلی ہوتی تو کھٹ کی آوازیں مسلسل آرہی ہوتیں۔ ایک کھٹکا کر کے بلی دم تھوڑے ہی سادھ لیتی۔ ابھی ذہن کے مختلف حصوں میں یہ بحث جاری تھی کہ ایسا لگا جیسے نچلی منزل پر کوئی بھاری چیز گھسیٹ رہا ہے۔ لیجیے صاحب ذرا سی جو امید تھی کہ شاید کوئی بلی ہے اور جان بچ جائے وہ بھی جاتی رہی۔ میں خاموشی سے بستر کی چادر سے نکلا اور پیر سلیپر میں اٹکائے بغیر ننگے قدم کمرے سے باہر آگیا۔ ارادہ یہی تھا کہ دبے پاؤں سیڑھیاں اتروں گا اور چور کو جا کر حیران کر دوں گا۔ آپ ٹی وی کا کوئی بھی ڈرامہ دیکھ لیجیے، اسی

ترکیب سے چور کی آنکھوں پر موم ٹپکا کر اسے پکڑتے ہیں۔ نہ جانے کیا سوچ کر نیک بخت کو بھی نہ جگایا۔ شاید لاشعور میں جو میری مردانگی نے اس کی حفاظت کا فریضہ اپنے ذمہ لے لیا تھا وہی کام دکھا رہا تھا۔ خیر صاحب تو میں آپ کو کیا بتا رہا تھا؟ ہاں بے وزن قدموں سے سیڑھی کے آخری پائیدان تک اتر گیا۔ کوئی بتی روشن کرنے سے پہلے میں ذرا جائزہ لے لینا چاہتا تھا۔ بتی روشن ہو جائے تو پھر دونوں فریقوں کو برابر کے فائدے اور نقصان کا احتمال ہوتا ہے۔ اندھیرے کے فائدے وہی لوگ جانتے ہیں جو اندھیرے میں کام کرنا جانتے ہیں۔ جن کو روشنی کی عادت پڑ جائے وہ اندھیرے میں بالکل بیکار ہو جاتے ہیں۔ سب سے نچلی سیڑھی پر پیر رکھا تو دائیں جانب سے مضبوط کاٹھی کا ایک نوجوان کھلا چاقو لیے سامنے آ گیا۔ وہ آٹھ انچ کا چاقو اس وقت کسی خنجر یا تلوار سے کم معلوم نہ ہوا۔ کوئی تیس برس کا سن، چوڑی ہڈی کی کاٹھی۔ کالی قمیض اور اس کے ساتھ کالی ہی جینز زیبِ تن۔ ذرا اس نے سر کو ہلایا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے عینک بھی پہن رکھی ہے۔ میری اپنی عینک کے عدسے دیدوں کے پھٹ جانے کی وجہ سے دھندزدہ محسوس ہو رہے تھے۔ نوجوان نے چاقو داہنے ہاتھ میں ذرا سامنے کے رخ پر رکھا کہ اس کا فاصلہ میری ہمت سے بمشکل ایک فٹ رہا ہوگا۔ کوئی شبہ نہ رہے کہ یہاں حاکم کون ہے اور محکوم کون۔ بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی ہونٹوں پر رکھ کے خاموش رہنے کا اشارہ کیا گویا بیوی کے جاگ جانے کا اسے ہم سے زیادہ ڈر تھا۔ پھر وہی انگلی ہونٹوں سے ہٹا کر اپنی گردن پر دائیں سے بائیں پھیر دی۔ یہ اشارہ نہ بھی ملتا تو بھی ہمارے دیوتا تو چاقو دیکھ کر ہی کوچ کر گئے تھے۔ ہم نے پھر بھی نسبتاً حوصلے سے کام لیا اور اپنی آواز کی ہمواری سے خود بھی حیرت زدہ ہو گئے۔

'کون ہو تم؟'

اس کی جرأت دیکھیے، وہ، ملعون مسکرا دیا۔ جیسے ہم نے کوئی مذاق کیا ہو۔ اول تو ہم جسے کڑک دار آواز سمجھ رہے تھے، وہ حلق سے بھنچی اور پھنسی کی کسی درمیانی شکل میں نکلی، مزید اس کے رویئے نے ہمارے حوصلے بالکل ہی پست کر دیے۔

'چور ہوں دکھائی نہیں دیتا۔'

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا کہ اندر کی کپکپی ظاہر نہ ہو جائے۔ کوشش کر کے

اوسان جمع کیے۔

'کیا چاہتے ہو؟'

'چور کیا چاہتا ہے؟' اب اس کمبخت کے ہونٹوں پر ایک واضح مسکراہٹ تھی۔ ہماری جان ہی تو جل گئی۔ لیکن اس کی مسکراہٹ سے یہ ہوا کہ غصہ میری کم ہمتی پر غالب آ گیا۔

'ٹھہرو میں پولیس کو بلاتا ہوں'، اب کے ہماری آواز واقعی کڑک دار تھی، مجھے لگا اس کڑک کا اس پر ذرا اثر بھی ہوا ہے۔

'پولیس بلا کر کیا کریں گے، کچھ دے دلا کر رخصت کیجیے، اب اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

'شرم نہیں آتی چوری کرتے ہو۔'

'بس اتنا دے دیجیے کہ پھر چوری کا کھٹکا نہ رہے، مرزا تو رہزن کو دعا تک دیتے تھے۔'

'اوہ پڑھے لکھے بھی ہو' میرا لہجہ اور شاید خوف خود بخود ایک درجہ کم جارحانہ ہو گیا۔

'طعن و تشنیع کی ضرورت نہیں ہو۔ الف زبر آ اور ب پیش بو کا قاعدہ ضرور پڑھا ہے، اس کو اگر آپ پڑھا لکھا کہیں تو یہ آپ کا حسنِ ظن ہے۔ تعلیم یافتہ مجھے یقین ہے میں ہرگز نہیں ہوں' لگتا تھا جیسے اس کی کوئی دکھتی رگ دب گئی ہو۔

'کہاں تک پڑھے ہو؟' اب میری حسِ تجسس بیدار ہو گئی اور میں وہیں سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ چور نے میرے سوال کو جواب کے قابل نہیں گردانا۔

'میاں شریف خاندان کے لگتے ہو، پڑھے لکھے ہو، اپنے حصے کا کیوں نہیں کھاتے۔ محنت مزدوری کی کھاؤ، قانون کی پاسداری کیوں نہیں کرتے؟' یہی وقت تھا اس کو مسلمان کر لینے کا۔

'آپ کرتے ہیں قانون کی پاس داری؟' پھر وہی تپا دینے والی مسکراہٹ۔

'ہاں کرتا ہوں، سو فیصد کرتا ہوں۔'

'کل رات جب ٹریفک سگنل بند تھا اور آس پاس کوئی نہیں تھا آپ نے زن سے گاڑی نکال لی تھی' اس نے مجھے چیلنج کیا۔

لگتا تھا کمینہ، بدذات، چور کئی دنوں سے میرا پیچھا کر رہا تھا۔ غالباً میرے شب و روز کا

حساب رکھے تھا۔

'ابھی رات کا ایک بجا تھا، دور دور تک کوئی گاڑی نہیں تھی، ایسے میں وہاں اکیلے کھڑے رہنا حماقت ہی ہوتی اور پھر خطرہ الگ' میرا لہجہ مدافعانہ تھا۔

'اس قسم کی چھوٹی موٹی حرکتیں تو آپ سے اکثر و بیشتر سرزد ہو جاتی ہیں' مجھے لگا طنز کر رہا ہے، میں نے اس کے جملے کا جواب نہیں دیا۔

'چور پھر بھی نہیں ہوں' میں نے اپنی برتری جتائی۔

'ہوں' اس نے ہنکارہ بھرا۔

'دو مہینے پہلے گروسری کی دکان پر اس نے غلطی سے پودینے کی دو گٹھیوں کے پیسے لگائے تھے جبکہ آپ کی تھیلی میں پودینے کی تین گٹھیاں تھیں۔ آپ نے اس کو ٹوکا تو نہیں۔ وہ تیسری گٹھی تو چوری کی ہوئی ناں' اس کے لہجے میں سچائی کی سفاکی تھی۔

'کون ہو تم۔ تم یہ کیسے جانتے ہو؟' پہلی بار مجھے اس سے بہت خوف محسوس ہوا۔ آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے سے ایک سیڑھی اوپر ہو گیا تاکہ اپنے اور اس کے درمیان فاصلہ بڑھا دوں۔

'اور پچھلے سال جب ریسٹورانٹ میں بیرے نے غلطی سے پیپسی کے پیسے نہیں لگائے تھے تب بھی آپ نے اسے نہیں ٹوکا۔ چوری کا مشروب پیا تھا آپ نے' اس کا بیان اسی یقین اور کاٹ دار صفائی سے جاری تھا۔

'کون ہو تم، یہ سب کیسے جانتے ہو؟' میری پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

'مرزا نے بھی قرض کی پی مگر کبھی چوری کی نہیں پی۔ آپ تو ایم اے ہیں جرنلزم میں، بقلمِ خود پڑھے لکھے ہیں۔ پھر یہ چوری کی پیپسی؟ اور مجھ سے یہ سوال کہ چوری کیوں کرتے ہو۔ چور تو ہم سب ہیں قبلہ صرف درجات کا فرق ہے۔

'میاں تم فلسفی ہو، شاعر ہو یا چور ہو؟'

'اگر چور ہوں تو شاعر کیسے ہو سکتا ہوں؟'

'عجیب منطق ہے تمھاری، کیا شاعر چور نہیں ہوتے؟'

'ہوتے ہیں لیکن بہت کم اور بہت معصوم۔ صرف شہرت اور توجہ کے خواہش مند۔ باقی

سب شاعر تو غربت کو چوری پر اور اصولوں کو سہولت پر ترجیح دیتے ہیں۔ احمق، اصول پسند شاعر۔ چور تو ذہین و فطین ہوتا ہے، اپنا اچھا برا سمجھتا ہے، موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے، پھر بھلا چور شاعر کیسے ہوسکتا ہے اور شاعر تو خیر ہرگز چور نہیں ہوسکتا۔

'مجھے اس بحث سے دلچسپی نہیں۔ میرا خیال ہے مجھے اب تک پولیس کو بلا لینا چاہیے تھا' میں نے اکتا کر کہا۔

چور منہ سے کچھ نہ بولا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چاقو کو انگلی پر گھمانے لگا۔ سچ ہے کچھ اشارے الفاظ سے زیادہ موثر ہوتے ہیں۔ اس کا پیغام بہت واضح تھا۔ سوچا باتوں میں لگائے رکھوں شاید پڑوسی جاگ جائیں یا کوئی اور صورت نکل آئے۔

'تمھیں ڈر نہیں ہے کہ پکڑے گئے تو ہاتھ بھی کٹ سکتا ہے سزا میں۔'

'دھمکایئے مت۔ ویسے ہاتھ کاٹے گا کون۔ اگر آپ کے ہاتھوں میں پتھر آگئے ہیں تو ضروری نہیں کہ آپ غلیل چلائیں ضرور۔ سامنے آپ کے آئینہ بھی ہوسکتا ہے۔ اس قدر شوق ہے شیشے کے گھر میں پتھراؤ کا۔ ان صاحب سے ملوا دیجیے جو پہلا پتھر چلانے کے حقدار ہوں۔ خیر یہ چھوڑیئے یہ بتایئے پکڑے گا کون۔ پکڑنے والے کے آگے پیٹ نہیں لگا کیا۔ کتنے ہی اقسام کے پیٹ پھول رہے ہیں ہمارے ہاں۔ بیماری کا پیٹ، جہیز کا پیٹ، قرضہ، تعلیم، جائیداد، جوئے کی لت، نشہ کی بیماری کا پیٹ۔ یہ سب بھوکے پیٹوں ہی کی قسمیں ہیں۔ تو فرض کیجیے کسی نوبھرتیے نے پکڑ بھی لیا تو کیا اس کے اوپر والا نہیں چھوڑ دے گا؟'

'کرپشن' میں نے دانت پیس کر کہا۔

'پھر وہی بے وقوفی کی بات۔ دیکھیے صاحب آپ اتنے تعلیم یافتہ ہیں لہٰذا بیوقوف تو ہو نہیں سکتے۔ اب اگر اس دماغی کیفیت کو درمیان سے نکال دیں تو فقط بچتا ہے بھولپن۔ بہت بھولے ہیں آپ، کرپشن کہاں نہیں ہے۔ آپ صرف پولیس والے کی رشوت ستانی کو کرپشن کہتے ہیں۔ مگر جب آپ اسکول میں سفارش کرکے داخلہ دلاتے ہیں تو کیا وہ کرپشن نہیں ہے۔ جب آپ ملازمت کسی جاننے والے کو دیتے ہیں۔ جب کہ اس سے زیادہ تجربہ کار اور تعلیم یافتہ امیدوار کو انٹرویو پر بھی نہیں بلاتے تو کیا وہ کرپشن میں نہیں ہے۔ جب آپ چیک کے بجائے نقد

رقم ادا کرتے ہیں تاکہ ٹیکس کے ریکارڈ میں نہیں آئے تو کیا وہ کرپشن نہیں ہے؟ آپ کو تو لگتا ہے سانپ سونگھ گیا ہے۔ آپ کہیں تو کچھ ذاتی مثالیں دوں۔ ارے صاحب حال یہ ہے کہ شریف آدمی ہوا میں معلق ہے کہ کہاں قدم رکھے۔ ایک ایسی کیچڑ بچھی ہے کہ جہاں قدم رکھو کالک تو لگے گی۔ خیر چھوڑیں آپ کا تو چہرہ سفید پڑ گیا ہے، اس اندھیرے میں بھی یہاں سے دیکھ سکتا ہوں؟

'نہیں، نہیں ضرور بتاؤ۔ میں نے کبھی کرپشن نہیں برتی۔ ہمیشہ حق حلال کی کھائی ہے۔ تمھیں جرأت کیسے ہوئی میرے متعلق یہ کہتے ہوئے، میری کمائی میں رشوت کی ایک پائی بھی شامل نہیں ہے۔' میں نے گرج کے کہا۔

'رشوت کا ذکر کون کر رہا ہے۔ جھوٹ بولوں تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔ جب آپ کا بیٹا فزکس کے پریکٹیکل میں فیل ہو رہا تھا تو آپ پڑوسی کو لے کر ممتحن کے پاس نہیں گئے تھے کہ پڑوسی ان کا سسرالی رشتہ دار تھا۔ اس طرح ایک طالب علم جو پاس ہونے کے لائق نہیں تھا وہ سفارش اور کرپشن سے پاس ہوگیا۔ ڈرائیونگ لائسنس آپ نے فرقان صاحب کے سہارے حاصل کیا تھا۔ ان کے پھوپھا لائسنس ڈویژن میں کام کرتے ہیں۔ آپ تو ایک مرتبہ اس دفتر کے پاس بھی نہیں پھٹکے۔ ٹیسٹ دینا تو دور کی بات ہے۔ اور ہاں پچھلی سردیوں میں جب آپ پاسپورٹ بنوانے گئے تھے، تو یاد ہے وہ باہر پیپل کے درخت کے نیچے ایجنٹ کو فارم، تصویریں اور پیسے دے دیے تھے کہ یہ اندر کھلا پلا کر جلد کام کروا دے گا، کون گرمی میں دھکے کھائے۔ ارے صاحب آپ تو بالکل خاموش ہو گئے۔ میرا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے۔ آپ تو نسبتاً بہت شریف آدمی ہیں۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ پولیس والا مجھے گرفتار کرنے میں دلچسپی ضرور رکھتا ہے مگر صرف اس لیے کہ مجھے چھڑانے کا سودا کر سکے۔ سمجھ رہے ہیں ناں آپ۔ دیکھیے اب صبح صادق کی ہلکی سی روشنی پھیل رہی ہے، کچھ دے دلا کر مجھے رخصت کیجیے۔ ساری رات کالی کر دی میری۔ اور کسی طرف بھی نہ جا سکا'۔

'کون ہو تم' میری آواز پر خوف غالب تھا۔ یا اللہ یہ جن ہے یا بھوت۔ یہ میرے روز و شب سے کیسے واقف ہے؟ کیا سی۔آئی۔ڈی کا بندہ ہے۔ کیا یہ میرا تعاقب کرتا رہا ہے مگر کب سے۔ یہ تو کئی سال پہلے کی باتیں ایسے بتا رہا ہے جیسے یہ ہر جگہ خود موجود رہا ہو۔ مختلف قسم کے

خیالات میرے ذہن میں اس تیزی سے گھومے کہ مجھے چکر آ گیا، اور میں پیچھے کی جانب گرنے لگا۔ چور نے دائیں ہاتھ میں چاقو تھامے رکھا، میری پہنچ سے دور جبکہ بائیں ہاتھ سے مجھے سہارا دے کر سیدھا کیا۔ اس کی اس حرکت سے میرے استعجاب میں اور اضافہ ہو گیا۔

'تم نے مجھے گرنے سے کیوں بچایا؟'

'کیوں بچایا، اچھا سوال ہے۔ کیا کہوں یہ تو میرا فرض ہے، لیکن اب یہ عمل ہمارے لاشعور سے نکل چکا ہے۔ اس لیے آپ کو حیرت ہو رہی ہے۔ کسی کو گرتا دیکھیں تو ہم بچانے کے بجائے دوسری طرف دیکھنے لگتے ہیں۔'

'کون ہو تم' میری زبان پر طوطے کی طرح وہی گردان تھی۔

'آپ کی ذہانت اور مردم شناسی کے تو بہت چرچے ہیں، اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں۔ ایک کھڑے ہوئے چھ فٹ کے چور کو نہیں پہچان پا رہے، بھاگتے چور کی لنگوٹی کیا پکڑیں گے؟' اس نے اپنے تئیں مزاح میں بات ٹال دی۔

میاں ابھی تک تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں ہے کہ تم کون ہو اور سچ بتاؤ کیا چاہتے ہو۔ ہاتھ میں چاقو ہے، اب تک تو تم ڈرا دھمکا کر بہت کچھ چھین سکتے تھے؟'

'چھین لینا اب مشغلہ قدیم ہو چلا ہے، اب ہے کمپیوٹر، ٹیلی پیتھی اور NGO's کا زمانہ۔ فن تو یہ ہے کہ لٹنے والا خود اپنے ہاتھ سے نکال کر دے۔ اور اگر نہ دے تو اٹھا لو، تاوان کی صورت مل جائے گا۔ ہمارے باہمی مذاکرات ابھی اجتہاد کی اس منزل کو نہیں پہنچے۔'

'پہنچیں گے بھی نہیں' میں نے استہزائیہ انداز میں جواب دیا۔ 'میں ایک غریب جرنلسٹ ہوں، کبھی کبھار افسانے بھی لکھ لیتا ہوں، بس اسی پر گزارہ ہے۔'

'غریب جرنلسٹ ایک متروک اصطلاح ہے۔ نئی لغات میں اس اصطلاح کا وجود ہی نہیں ہے۔ اب یا تو آپ غریب ہو سکتے ہیں یا جرنلسٹ۔ دونوں خصوصیات ایک ہی شکل میں سما جائیں تو معاملہ بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔ غریب جرنلسٹ کو عموماً صلیب انعام میں ملتی ہے، کیوں کہ آپ ماشا اللہ زندہ ہیں لہٰذا ثابت ہوا کہ جرنلسٹ ضرور ہیں غریب بالکل نہیں۔'

'میاں افسانے لکھ کر پیٹ پال رہا ہوں۔'

'آپ کے خیال، میں شاید میں مریخ کا باشندہ ہوں۔ اب کیا شعر و ادب کی تخلیق بھی ذریعہ معاش بنے گی۔ افسانوں سے آپ گرہستی تو کیا کاغذ اور قلم کی قیمت بھی نہیں نکال سکتے۔ اب تو یہ دور ہے کہ اچھا افسانہ نگار ہو مگر کھاتے کہاں سے ہو؟'

'خیر میاں تم پر ایک افسانہ تو ضرور ہوگا۔'

'اور اس افسانے میں خود بہ خود کسی طرح موپاساں یا کسی اور مغربی افسانہ نگار کے افسانے کی جھلک نظر آجائے گی، پھر کہتے ہیں کہ چور کوئی اور ہے۔ اور مجھ پر افسانہ لکھنے سے کیا لوگ مجھے پہچان جائیں گے۔نہیں صاحب میں تو ایک عام کردار ہوں۔ دائیں، بائیں، آگے، پیچھے کہیں دیکھ لیجیے، ملاقات ہو جائے گی۔ ایک عام آدمی جو ہمارے معاشرے میں ہر قدم اور ہر سانس پر چوری کر رہا ہے، کوئی ضرورتاً، کوئی مجبوراً اور کوئی عادتاً۔ اب شاید چوری نکل جائے ہماری روز مرہ سے تو بہت مشکل ہو جائے شناخت بھی۔ ایمان داری کی فضا میں بہت حبس ہوتا ہے، ہم لوگوں کی سانس رک جائے گی،نہیں جناب مجھ غریب پر افسانہ لکھنے کی کیا ضرورت ہے، اپنی ذات کو مشقِ ستم بنائیے۔'

'اپنے اوپر افسانہ لکھوں، کیا لکھوں بھلا، کیوں بیوقوفی کی باتیں کرتے ہو۔'

'کیوں قبلہ اپنے اوپر افسانہ کیوں نہیں لکھ سکتے، کیا روز صبح آئینہ دیکھے بنا کنگھا کرتے ہیں۔ ماشاء اللہ کیسی پہلودار شخصیت ہے۔ روز ایک نیا افسانہ لکھ سکتے ہیں، بس ذرا خود آگاہی کی کمی ہے۔'

فراز کون ہے، آپ کس سے باتیں کر رہے ہیں چھپ کر اس وقت؟' میری بیوی کی آواز آئی تو احساس ہوا کہ پچھلے پانچ منٹ سے اس کے خراٹے بند ہیں۔

'ان کو مطمئن کر دو یہیں سے۔ مرد ہو، اتنا تو کر سکتے ہو؟' بدبخت کی وہی استہزایہ ہنسی، اور چاقو کی ہلکی سی جنبش 'کوئی نہیں بیگم۔ نیند نہیں آرہی تھی۔ اس لیے اٹھ آیا۔تم سو جاؤ۔' مجھے یقین تھا کہ میری آواز کے زیر و بم سے وہ ضرور سمجھ جائے گی کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ اور پھر لفظ بیگم کا استعمال بھی اسے ناپسند تھا۔ نیک بخت ہمیشہ لڑتی تھی کہ بیگم سمجھا کریں کہا مت کریں۔

'جلد واپس آجائیں بستر میں' نیک بخت نے گرہ لگائی۔

صبح صادق کی روشنی اب اتنی پھیل گئی تھی کہ مجھے اپنے رونگٹے کھڑے نظر آنے لگے۔ چور نے میرے چہرے کے تاثرات سے معاملہ بھانپ لیا۔

'آپ جان بوجھ کر دیر لگا رہے ہیں' وہ اپنی آواز دھیمی رکھنا بھول گیا۔

'فراز کون ہے یہ، اور آپ یہ سیڑھیوں پر کیوں بیٹھے ہیں؟' اس دفعہ بیوی کی آواز عقب میں بہت نزدیک سے آئی۔

'کون ہو تم اور کیا چاہیے میرے شوہر سے' اس کو چاقو نظر نہیں آیا، میرے عقب میں اپنا وجود سمیٹتے ہوئے بولی۔

'آپ کا شوہر کیا آپ کو یقین ہے۔'

'کیا حماقت آمیز بات ہے یہ، مجھے کیا اپنے شوہر کی پہچان نہ ہوگی؟'

'کیا بکواس ہے بھئی، اس خرافات کا کس کے پاس وقت ہے؟' میں فوراً بیچ میں کود پڑا۔ یہ بات نکل گئی تو دیکھیے کہاں جا کر رکے۔ یہ کمبخت تو عالمِ بالا کی بات بالا خانے تک پہنچانے کا ماہر ہے۔ نرا افلاطون، کیا معلوم بیوی کے سامنے کیا پٹارہ کھول دے۔ بات جب تک پیٹ میں رہے، راز ہے۔ جہاں زباں تک کا سفر کیا پرائی ہوگئی۔ پھر یہ کہ اس قسم کے تذکروں کی ابتدا اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے، انتہائی سرا ہمیشہ تماشائی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

'چلیے جانے دیجیے' اندھیرے میں کم از کم اس کی منحوس مسکراہٹ چھپی رہتی تھی، اب بہت کھلنے لگی۔

'بیگم صاحبہ آپ بہت نیک دل خاتون معلوم ہوتی ہیں، میں ایک معمولی چور۔ ساری رات آپ کے شوہر کے ساتھ کالی ہوگئی۔ بہت بخشیے ہیں۔ میرے گھر میں کھانے کو بھی کچھ نہیں۔ ہو سکے تو کچھ دے دلا کر رخصت کیجیے۔'

'باؤلا ہوا ہے کیا، اچھا یہ بتا سو کا کھلا ہے تیرے پاس؟'

'سو کا کھلا تو نہیں، بندھے ہوئے دو ہیں' چور نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

'ہاہا پھنس گیا کمبخت' میں بیوی کی ان چالوں سے خوب واقف تھا۔

'ارے جب سو روپے کے دو نوٹ جیب میں موجود ہیں تو مجھ سے کیوں مانگ رہے ہو۔

مں چوروں کونہیں پالتی۔ وہ بھی تم جیسا ہٹا، کٹا، چرب زبان چور۔ میاں کچھ کام کرلو۔ چوری ہی کا شوق ہے تو سیاستدان بن جاؤ۔ کیوں منہ پر کالک مل رہے ہو اپنے۔' وہ جو کہتے ہیں ناں 'چوروں کو لگ گئے موز' تو انھوں نے شاید میری بیوی کو ایکشن میں دیکھ کر ہی کہا ہوگا۔

'لو وہ بھی کہتے ہیں بے ننگ و نام ہے' چور نے بے محل مصرعہ پڑھا۔' آپ فرماتی ہیں منہ پر کالک نہ لگاؤں دوسری طرف یہ بھی مشورہ ہے کہ سیاستدان بن جاؤں۔ یہ ہر دو کام ایک ساتھ کیسے ممکن ہیں کچھ آپ ہی فرمادیں۔'

'فراز فوراً پولیس کو فون کیجیے۔ بے محل شعر پڑھنے والوں کو تو میں ویسے بھی قابلِ دست اندازئ پولیس سمجھتی ہوں۔'

'ارے ارے ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ یہاں صرف میں ہی چور ہوں کیا؟' وہی چاقو کی مخصوص پیش قدمی۔' مجھے چور کہنا بہت آسان ہے۔ غریب ہوں، غربت کو لوگ کتنے ہی ناموں سے پکارتے ہیں۔ آپ نے اس عید پر اپنی بہن کو دو ہزار کی ساڑھی دی تھی، جبکہ نند کو صرف چھ سو کی ساڑھی پر ٹرخایا تھا۔ یہ رشتوں میں بد دیانتی ہے۔' اس کا روئے سخن میری بیوی کی طرف تھا مگر کن انکھیوں سے میرا رنگِ عمل دیکھ رہا تھا۔

'اس لیے کہ اس سے پچھلی عید پر میں نے اس سے بالکل الٹ معاملہ کیا تھا، سو حساب برابر ہو گیا۔' نیک بخت نے بظاہر بہت رسان سے جواب دیا۔

'اچھا اور وہ جو آپ ماہانہ خرچ میں سے پیسے چرا چرا کر پرانے تکیے کے غلاف میں بھرتی ہیں، وہ بھی تو ایک قسم کی چوری ہے۔'

'مردود، خدا فراز کو اپنی امان میں رکھے۔ اس لیے جمع کیے ہیں کہ بیماری آزاری میں کام آئیں' فراز کو اس کا علم ہے بیوی کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں، چور پہلی دفعہ کچھ بوکھلایا ہوا نظر آیا۔

'اوہ، وہ پچھلے سال اسلام آباد جاتے ہوئے، اکرام صاحب نے آپ کو اکنامی سے فرسٹ کلاس میں بٹھا دیا تھا۔ صرف اس لیے کہ اکرام صاحب چاہتے ہیں آپ کے شوہر ان کے حق میں ایک اچھا کالم لکھ دیں اخبار میں۔' چور نے فاتحانی انداز میں کہا، اسے یقین تھا اب میری بیوی کو اپنی کرپشن کا اقرار کرنا ہی پڑے گا۔

'ہاں ان کے اصرار پر دل رکھنے کو میں فرسٹ کلاس میں بیٹھ گئی تھی۔ لیکن جب طیارہ پرواز کر گیا تو میں واپس جا کر اکنامی کلاس میں بیٹھ گئی۔ تم کیا سمجھتے ہو میں اکرام کے اس لطف و کرم کی وجہ سے واقف نہیں تھی۔' اب بیوی کا پارہ خطرے کے نشان سے اوپر جا چکا تھا۔

'فراز آپ فون نہیں کریں گے پولیس کو، عورتوں کے بلانے پر پولیس ویسے بھی جلدی آجاتی ہے' بیوی یہ کہہ کر پلٹی اور بھاگ کر سیڑھیاں چڑھ گئی۔ چور نے جانا کوئی لمحہ جاتا ہے کہ پکڑا جائے گا، لپک کر چاہا کہ بیوی کو روک لے۔ میں درمیان میں آ گیا، میں نے چاہا اس کا ہاتھ پکڑ لوں۔ زور آزمائی میں اسے مشکل یہ پڑی کہ وہ سیڑھیوں کے اس طرف تھا جبکہ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ سیڑھی کے ہتھے سے گھوم کر اس کشمکش میں چاقو اس کے پہلو میں گھس گیا۔ وائے حیرت کہ اس کے جسم سے خون کا ایک قطرہ نہ نکلا۔ ایسے لگا جیسے چاقو کسی سائے میں جا گھسا ہو۔ چور نے بہت شاکی نظروں سے مجھے دیکھا، چاقو کھینچ کر باہر نکالا۔ لپیٹ کر جیب میں رکھا، دونوں ہاتھ سے تالی بجائی اور ڈرائنگ روم میں آویزاں قد آور آئینے میں گم ہو گیا۔ میں اس تماشے سے بدحواس ہو کر واپس اوپر جانے کے لیے پلٹا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بیوی ایک سوٹ کیس ہاتھ میں لیے کہیں جانے کے لیے تیار کھڑی ہے۔

'بھگا دیا' اس کی آواز میں مایوسی تھی۔ 'مجھے معلوم تھا آئینے میں نہیں رہ سکو گے، میں بلاوجہ اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔' میں منہ گریباں مین ڈال کر نہ جانے کیا ڈھونڈنے لگا۔

دوسرا رخ

یہ غالباً اپریل ۱۹۹۶ء کی بات ہے، غالباً کیا، مجھے اچھی طرح وہ تاریخ، دن بھی یاد ہے۔ کچھ یادیں ایسی ہی ہوتی ہیں، گھٹنے کے زخم پر کھرنڈ کی مانند۔ ہمیشہ کھرچتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ نیچے زخم بھر گیا ہے یا نہیں۔ اگر وقت سے پہلے کھرنڈ ہٹا دیں تو زخم پھر ہرا ہو جائے۔ مجھے یہی مرحلہ کچھ یادوں کے ساتھ درپیش رہتا ہے۔ کچھ وقت گزر جائے تو اتنی تکلیف نہیں دیتیں، وقت سے پہلے کریدلیں تو چنگاریاں پھر بھڑک اٹھتی ہیں۔

ہاں تو اپریل کی اس شام میں اپنے دورے سے جلدی واپس آ گیا تھا۔ بس نوکری کچھ ایسی ہی تھی، ایک قدم یہاں ایک وہاں۔ پیسے اتنے اچھے ملتے تھے کہ موتیوں سے بیوی کا منہ بند تھا، ورنہ وہ نیک بخت اب میرے دوروں سے تنگ آنے لگی تھی۔ اس دفعہ دبئی سے مجھے جمعے کو واپس آنا تھا مگر کام جلد ہو گیا تو میں بدھ ہی کو واپس آ گیا اور اب پانچ دن کی چھٹیاں منا رہا تھا۔

'سوچتا ہوں آج محمود کو دیکھ آؤں، بہت دن ہو گئے اس کی کوئی اطلاع ہی نہیں۔ وہ کبھی اتنے عرصے خاموش نہیں بیٹھتا، فون تو ضرور ہی آ جاتا۔ اکیلا بندہ ہے بیمار ہی نہ پڑ گیا ہو' میں نے بیوی سے مشورہ کیا۔

'ہاں ضرور دیکھ آیئے، میں نے تو کتنی بار کہا ہے محمود بھائی سے کہ اب شادی کر لیں، مگر

ہمیشہ ہنس کر ٹال دیتے ہیں۔'

فرخندہ کی بات سن کر میں نے بہ مشکل اپنی مسکراہٹ دبائی۔ اس سچ کا میں پہلے اتنی بار گلا گھونٹ چکا تھا کہ اب میں خود بھول چکا ہوں کہ سچ کیا ہے۔ضروری تو نہیں کہ دوستوں کی ہر اچھائی برائی بیوی کو معلوم ہو۔ یہ باتیں منٹو کے افسانوں میں ہی اچھی لگتی ہیں کہ محبوب کے جسم کی گرمی سے سارے منجمد راز پگھل جائیں۔ اچھا ہے کہ بیوی کے سامنے سارے دوست کم از کم فرشتہ تو ضرور ہوں۔ ذرا سوچیے تو آپ کو بھی اس کے فوائد سمجھ آ جائیں گے۔

میں نے پتلون پر ایک جرسی نما قمیض پہن لی۔ اپریل کا مہینہ ایسا ہی ہوتا ہے بے یقینی کا۔ نہ سردی کا یقین نہ گرمی کا۔ چاہو ہلکا سا سوئیٹر پہن لو چاہو آدھی آستین کی قمیض۔ ہر دو صورتوں میں کوئی نظر نہیں اٹھاتا۔ ورنہ جولائی کے مہینے میں سوئیٹر یا دسمبر کے مہینے میں آدھی آستین کی قمیض پہن کر کسی بس میں بیٹھ جایئے، امکان غالب ہے کہ اگلا مسافر آپ کے برابر میں سیٹ خالی ہونے کے باوجود کھڑے رہ کر سفر طے کرنا بہتر سمجھے گا۔ خیر گیراج سے کار نکال کر میں نے محمود کے گھر کی راہ لی۔ ہمارے گھروں کے درمیان تقریباً پانچ میل کا فاصلہ تھا جو کار میں بہ مشکل پانچ منٹ کی مسافت تھی۔ مجھے ڈرائیونگ میں بہت مزا آتا تھا۔ ریڈیو لگا کر بیٹھ جائیں۔ اگر آپ ٹریفک کے شور کو اندر نہ آنے دیں تو بس کام بن گیا۔ خاص کر سیدھی سڑکوں پر ایک یا دو گھنٹوں کی مسافت سے تو بہت سوچنے سمجھنے کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ محمود کا گھر لیکن اتنا قریب ہے کہ بے فکری کا سوئچ آن ہونے سے پہلے ہی اس کا گھر آ جاتا۔ لمبی مسافتیں اس اعتبار سے چھوٹی مسافتوں سے بہتر ہوتی ہیں۔

محمود کے پھاٹک کے قریب پہنچ کر میں نے ہلکے سے ہارن بجایا۔ متوسط طبقے کے لوگوں کا علاقہ تھا۔ چھوٹے ایک یا دو کمروں کی مکان نما عمارتیں، شانہ بہ شانہ ایک قطار میں کھڑی ہیں۔ محمود کی ہونڈا سوک باہر گیراج کے سامنے کھڑی ہے، ہر گھر کے سامنے ایک مختصر باغیچہ ہے۔ صدر دروازے کے بائیں ہاتھ پر ایک کار کا گیراج، گیراج کے اوپر ایک کمرہ، جس میں سامنے کے رخ پر ایک گول کھڑکی ایستادہ ہے۔ کھڑکی کے اطراف لکڑی کی پٹی لگی ہے اور درمیان میں دو پٹیاں اوپر سے نیچے اور شرقاً غرباً ایسے جڑی ہیں کہ کھڑکی کو گویا چار حصوں میں

تقسیم کر دیا ہے۔ یوں ہر گھر کے گیراج کے اوپر گویا یہ آنکھ پیوست ہے جو مہمان کے آنے سے پہلے مہمان کو تاڑ لیتی ہے۔ محمود کی سوک پر ہلکی سی مٹی جمی ہے، اتنی نہیں کہ آنکھوں کو چبھے مگر اتنی ضرور کہ صاف معلوم ہو کہ اسے پچھلے کئی دن سے کپڑا نہیں لگا۔، یہ ذرا انہونی سی بات تھی۔ محمود ایک دوا ساز ادارے میں مارکیٹنگ کے شعبے سے وابستہ ہے اور ظاہری صفائی اور ستھرائی اس پیشہ کی صحت کا ایک لازمی جز ہے۔ عموماً میرے ہلکے سے ہارن پر محمود فوراً گول کھڑکی میں نمودار ہو جاتا ہے مگر آج کھڑکی سنسان کھڑی رہی۔ میں نے اپنی گاڑی محمود کی ہونڈا کے پیچھے کھڑی کر دی اور باہر نکل کر صدر دروازے پر گھنٹی بجائی۔ دو گھنٹیوں کا کوئی جواب نہ آیا تو میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جب محمود کو یقین ہو گیا کہ میں ٹلنے والا نہیں تو بجائے مجمع لگانے کے اس نے بہتر جانا کہ دروازہ کھول دے۔

دروازہ کھلا تو میں محمود کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ میرا وہ دوست تو نہیں جس سے میں ملنے آیا تھا۔ وہ بہت حد تک مدقوق ہو چکا تھا۔ گال جن پر کبھی بے فکری اور شادمانی کی سرخی جھلکتی تھی ان پر بیماری کی زردی سایہ دار تھی۔ شیو ہلکا سا بڑھا ہوا، بشرے سے تھکن کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی پریشانی پر مسکراہٹ کا پردہ ڈالا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

'کہاں ہو یار بالکل عید کا چاند ہو گئے ہو۔'

'دوسرا دھچکا اس وقت لگا جب محمود نے میرا بڑھایا ہوا ہاتھ نظر انداز کر دیا۔' ایک طرف ہو کے میرے داخلے کا راستہ چھوڑ دیا۔

'کیوں آئے ہو؟' محمود نے ایسے سوال کیا جیسے اسے یقین تھا میں ضرور آؤں گا مگر چاہتا تھا کہ شاید نہ آؤں۔

'کیوں آئے ہو؟' میں نے حیرت سے اس کا سوال دہرایا۔ 'کیا دواؤں کے ساتھ عقل بھی بیچ آئے ہو اور یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے۔ تقریباً تین مہینے سے نہ خط نہ فون۔ گھر آنا تو درکنار۔ میں تو تمھاری طرف سے بہت پریشان ہو گیا ہوں' میں نے پریشانی سے کہا۔

محمود میری طرف خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا، گویا میرے الفاظ کو جذب کر رہا ہو۔ یا جو اس نے سنا، وہ اس بات سے مختلف تھا جس کے سننے کی اسے امید تھی۔

'لگتا ہے تم نے سنا نہیں؟'

'کیا نہیں سنا؟' اس کی بے تکی باتیں میری سمجھ میں تو آ نہیں رہی تھیں۔

'معاف کرنا یار۔ اندر آ جاؤ، یہاں اس طرف، میں سمجھا شاید' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ محمود کسی ذہنی انتشار کا شکار تھا۔ میں نے فوراً نہیں کریدا بلکہ باورچی خانے سے ملحق چھوٹی سی بیٹھک کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں ٹی وی کے سامنے صوفے پر ہم دونوں نشستے تھے، سیاست پر، کھیلوں کے مقابلوں پر، مذہب پر، کون سا موضوع تھا جو ہم لوگوں سے بچ رہا تھا۔ کبھی اس میں دوسرے دوست بھی شامل ہو جاتے۔

'ہاں اب سکون سے بتاؤ مسئلہ کیا ہے' میں نے صوفہ پر بیٹھ کر کہا۔ اندر آتے ہوئے میں دیکھ چکا تھا کہ محمود کا باورچی خانہ جو اپنی صفائی میں گھریلو خواتین کو بھی پیچھے چھوڑ دے، کئی دن سے صاف نہیں ہوا تھا۔ جھوٹے برتنوں کا ایک تخار لگا تھا۔ ایک پلیٹ میں ادھ کھائی روٹی اور نچی ہوئی ہڈی پڑی تھی۔ محمود کی خواتین میں مقبولیت کا ایک راز اس کا انتہائی صاف ستھرا گھر تھا، جس پر اکثر ہم مردوں کو بیویوں سے طعنے ملتے۔ خیر محمود کا حلیہ، اس کی گفتگو اور پھر اب گھر کا حال سب ایک ہی کہانی سنا رہے تھے کہ کہیں بہت گڑبڑ ہے۔

'طاہر پچھلے ایک ماہ سے کھانسی میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ پہلے تو میں ہلکا موسمی زکام سمجھا، پھر ایک ڈاکٹر نے نمونیے کی دوا دی، اس سے بھی ٹھیک نہ ہوا تو میں ایک اسپیشلسٹ کے پاس گیا' محمود نے بات ختم ہونے سے پہلے ختم کر دی۔ یہ ادھورے جملے بہت معلوماتی ہوتے ہیں۔ میں نے منہ سے کچھ نہ کہا صرف نظر اٹھا کے محمود کو دیکھا، وہ مزید کچھ کہنے سے ہچکچا رہا تھا۔

'پھر' بالآخر مجھے لقمہ دینا پڑا۔

'اسپیشلسٹ نے مجھے ایڈز کا مرض بتایا ہے' محمود کے منہ سے گویا یہ الفاظ پھٹ پڑے۔ یہ اس کے سینے میں نہ جانے کب سے دبے تھے بالآخر ایک نکتے پر آ کر مزید نہ رک سکے۔ یہ جملہ ادا کر کے گویا محمود تو پرسکون ہو گیا۔ میرے سارے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ اگر اس وقت محمود کمرے میں بم بھی پھوڑ دیتا تو مجھے شاید اتنی حیرت نہ ہوتی۔ محمود جو جملہ ادا کر کے نیچے دیکھ رہا تھا، اب اس نے نظریں اٹھا کر میرے چہرے کی جانب دیکھا گویا میرا ردِعمل پڑھ رہا

ہو۔ یہ میری زندگی کے ان تکلیف دہ لمحات میں سے ایک تھا جب مجھے پتہ نہیں تھا کہ میں کیا کہوں، چپ رہوں یا اسے تسلی دوں ۔ میرے عزیز ترین دوست کو ایڈز ہے۔ یہ بات میرے ایک کان سے گھس کر پورے جسم میں دھموکے لگاتی پھر رہی تھی، دوسرے کان سے نکل نہیں پا رہی تھی۔ محمود سے آنکھیں ملائیں تو لگا کسی اجنبی کی آنکھیں ہیں۔ زندہ آنکھوں میں ایک روشنی ہوتی ہے، محمود شاید زندہ تو تھا لیکن آنکھوں میں زندگی کے دیپ بجھ چکے تھے۔

'کتنے عرصے پہلے کی بات ہے' میں نے بالآخر ہمت کر کے پوچھا۔

'تین ہفتے دو دن پہلے۔'

'لیکن آجکل تو میڈیکل سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے، لوگ ٹھیک بھی تو ہو جاتے ہیں' مجھے اپنی آواز خود ہی کھوکھلی لگی۔

محمود کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ منہ سے کچھ نہ بولا۔

'ڈاکٹر کہتا ہے معاملہ بہت بڑھ گیا ہے، چند ہفتوں کا کھیل باقی ہے۔'

'ڈاکٹر کچھ بھی کہے، تم اپنا علاج باقاعدگی سے کراؤ۔ اور یہ اپنا حلیہ ٹھیک کرو۔ ضروری تو نہیں کہ بیمار آدمی مجنوں بھی بن جائے، شیو کرنے میں کیا حرج ہے' میں نے ہلکے پھلکے مذاق کی بھی کوشش کی۔

'اور یہ باورچی خانہ اتنا گندا کیوں ہو رہا ہے، باہر گاڑی پر بھی گرد جمی ہے۔ محمود تمھارا ایک معیارِ زندگی ہے جس سے لوگ تمھیں شناخت کرتے ہیں۔ تمھاری ذات سے کچھ قدریں وابستہ ہیں، جن پر مجھے اور تمھیں دونوں کو فخر ہے، انھیں نہ گراؤ۔ اس سے تم مصروف بھی رہو گے' کوئی اور وقت ہوتا تو میں اٹھ کر اس کا ہاتھ بھی بٹاتا اور صفائی شروع کرا دیتا۔ اس وقت نہ جانے کیوں میں اس کی چیزوں کو چھوتے ہوئے بھی ڈر رہا تھا۔

محمود پر لگا جیسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا ہو۔ 'تم ایک ایسے آدمی کو قدروں کا سبق دے رہے جس کے پاس زندگی کے دو ہفتے باقی ہوں، یہاں زندوں کو قدروں کی فکر نہیں، تم مجھے سبق پڑھا رہے ہو' اس کی ہنسی نہیں رکتی تھی۔ میں نیچے دیکھتا رہا۔ ہمارے رشتے میں پہلی بار خاموشی زیادہ بول رہی تھی۔

'یار میں چلتا ہوں۔ آتا جاتا رہوں گا، کوئی بھی کام ہو مجھے ضرور بتانا۔ ابھی میں تمھاری بیماری کا فرخندہ سے ذکر نہیں کروں گا۔ تمھیں تو پتہ ہی ہے اس کو pregnant ہوئے چھ ماہ ہوگئے ہیں، بلا وجہ اثر لے گی۔' میں نے محمود کو سمجھایا۔ گھر سے نکلتے ہوئے ایک عجیب شرمندگی اور بے یقینی کا لمحہ آیا۔ میں محمود سے ہاتھ ملانے سے ہچکچا رہا تھا۔ میرے خیال میں تو محمود خود ہی بہانے سے ذرا دور ہو گیا تھا تا کہ میرے اور اس کے درمیان اتنا فاصلہ ہو جائے کہ ہاتھ ملانے یا نہ ملانے کا مشکل فیصلہ ٹل جائے۔

میں گھر پہنچا تو فرخندہ کھانا لگا چکی تھی۔ میرے دورے سے جلدی گھر آنے پر وہ خاصی خوش تھی۔ اس دوران اس نے اپنے اوپر، گھر کی صفائی پر اور کھانا بنانے پر خاصہ وقت خرچ کیا تھا۔ اس کی خوشیوں میں دکھ گھولنے کا احساس مجھے مجرم سا کر گیا، خودغرضی نے پھر ضرورت کا لبادہ اوڑھ لیا۔

'ارے محمود بھائی کو بھی لے آتے کھانے پر' فرخندہ نے سلاد کاٹتے ہوئے کاندھے پر سے منہ موڑ کر کہا۔

میں نے جواب نہیں دیا اور کھانے کی کرسی پر دھم سے بیٹھ گیا۔

'کیا ہوا خیریت تو ہے، کیا لڑ کر آئے ہیں دوست سے' وہ ہنس کر بولی۔

میری طرف سے جواب نہ پا کر اس نے چھری شیلف پر رکھی اور پوری طرح مڑ کر میرا سامنا کیا۔

'کیا ہوا طاہر آپ چپ کیوں ہیں، خیریت تو ہے، آپ مجھے پریشان کر رہے ہیں۔

'ارے کچھ نہیں وہ محمود کی طبیعت ٹھیک نہیں۔'

'ارے تو ٹھیک ہو جائے گی، اس میں اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے، خیریت تو ہے کیا ہوا ہے محمود بھائی کو۔'

میں نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا، خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

'کیا ہوا طاہر، کیا کوئی سیریس بات ہے۔'

'ہاں محمود کو ایڈز ہے'، میں جو سوچ کر آیا تھا کہ فرخندہ کو کچھ نہ بتاؤں گا، چھپا نہ سکا۔

'ایڈز؟' فرخندہ کا ہاتھ اپنے منہ تک پہنچ گیا۔ میرے برابر والی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

'لیکن ایڈز تو۔۔' کچھ سوچتی ہوئی آواز میں بولی لیکن جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

'لیکن ایڈز تو صرف جنسی عمل سے پھیلتی ہے اور محمود بھائی تو غیر شادی شدہ ہیں۔' بات اس کی سیدھی سادھی سوچ سے باہر تھی، یا اسے محمود کی ذات کے ساتھ وہ بہتان سوچتے ہوئے مشکل ہو رہی تھی۔

'خیر ایک تو یہ کہ ایڈز صرف جنسی عمل سے نہیں، بلکہ جسم کی رطوبت سے پھیلتی ہے، ظاہر ہے جنسی عمل اس کا ایک ذریعہ ہے۔ جیسے ایڈز کا مریض کسی اور کو خون دے دے تو اس سے بھی پھیل سکتی ہے۔ یا کوئی شخص ایڈز کے مریض کی استعمال شدہ سوئی یا انجکشن استعمال کر لے۔'

'تو محمود بھائی کو کیسے لگی۔'

'محمود gay (ہم جنس پرست) ہے' میں نے اتنی آہستہ سے کہا کہ خود اپنی آواز نہ سن سکا۔

'محمود بھائی کیا ہیں؟'

'Gay, gay، بتایا تو تم کو' میں نے چڑ کر جواب دیا۔

'محمود بھائی Gay ہیں ۔لیکن وہ تو۔۔ وہ تو بالکل صحیح لگتے ہیں' فرخندہ بہت الجھ رہی تھی۔

'تو gays کے کیا سر پر سینگ ہوتے ہیں' میری جھلاہٹ جاری تھی۔

'میری سمجھ میں نہیں آ رہا محمود بھائی Gay ہیں اور آپ کے دوست بھی، کیا آپ کو معلوم نہیں تھا؟'

اب اس قسم کی گفتگو کا کوئی کیا جواب دے۔'تو Gay کیا انسان نہیں ہوتے۔ پھر محمود کے جنسی رویوں کا میری دوستی سے کیا تعلق۔'

'آپ کو یہ بات معلوم تھی' اس نے اپنا سوال دہرایا۔ اب یہ سوال میرے لیے ذرا ٹیڑھا تھا۔ اس سے کئی اور ضمنی سوالات نکلتے تھے۔

'مجھے کچھ اندازہ تھا' میں نے ملا جلا سا جواب دیا۔

'ہاں اگر یہ حرکتیں ہیں تو پھر یہ تو ہونا تھا' فرخندہ کی منطق پٹری سے اتر گئی۔

'بھئی کیا کہہ رہی ہو۔ وہ بیچارہ بسترِ مرگ پر بیٹھا ہے۔ تم اس کو صلواتیں سنا رہی ہو۔'

'اب آپ کو اس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔'

'جاہلوں جیسی باتیں نہیں کرو۔ ایڈز کے وائرس کوئی اس کے گھر کی ہوا میں تھوڑے ہی گھوم رہے ہیں کہ مجھے لگ جائیں گے۔اس طرح مصیبت کے وقت میں کوئی چھوڑتا ہے اپنے دوست کو۔ مجھے ایڈز ہوتی تو کیا تم مجھے چھوڑ کر چلی جاتیں۔'

'خدا نہ کرے۔ اول فول مت بکیں۔کوئی چیز تو نہیں چھوئی تھی آپ نے ان کے گھر کی۔'

'ارے میں زیادہ دیر رک ہی نہ سکا۔'

'کچھ کھلایا پلایا تو نہیں انھوں نے۔'

'فرخندہ پلیز مجھ سے بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔'

'اس سے تو بہتر تھا محمود بھائی اچانک مر جاتے یا انھیں کینسر ہو جاتا، یا کسی ٹرک سے ہی ٹکرا جاتے۔'

میں اس کے بعد دو تین دن محمود کی طرف نہ جا سکا۔فرخندہ کی پہلی زچگی تھی، وہ خاصی موڈی ہو گئی تھی۔ اس کا خیال پھر دفتر کا کام۔کوئی ہفتہ کے بعد میں فرخندہ کو اس کے چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے مطب چھوڑ گیا۔جتنی دیر اسے وہاں لگتی ، میں بجائے انتظار کرنے کے محمود کے ہاں ہو لیا۔محمود کی گاڑی اپنی مخصوص جگہ کھڑی تھی۔ اس پر سے گرد صاف ہو چکی تھی۔ میرے دستک دینے سے پہلے ہی اس نے دروازہ کھول دیا۔اسے وہیل چیئر پر بیٹھا دیکھ کر مجھے شاک سا لگا۔

'آو بھئی طاہر' اس نے دروازہ کھول کر اپنی وہیل چیئر ایک طرف کر لی تاکہ میرے لیے راستہ بن جائے۔محمود اس ایک ہفتے میں مزید گھل گیا تھا۔اس نے مجھ سے ہاتھ ملانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

'محمود تم تو مجھے اور کمزور لگ رہے ہو، کیا حال ہیں' میں نے جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے پوچھا، کم از کم اس نے شیو بنا رکھی تھی۔گھر صاف ستھرا ہو گیا تھا۔

'میں نے ڈاکٹر سے معلوم کر لیا ہے۔ میری استعمال کی ہوئی چیزیں مثلاً گلاس، پلیٹ، بستر وغیرہ چھونے سے ایڈز نہیں پھیلے گی، نہ کسی اور کو لگے گی' محمود شاید میرے ہاتھ پتلون میں

دیکھ چکا تھا۔

'ارے یہ سب تو مجھے معلوم ہے' میں نے کچھ کھسیا کر جواب دیا۔

'بس یار تمھارے جانے کے دوسرے دن طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی۔ تین دن ہسپتال میں رہا۔ پرسوں ہی رہائی ملی ہے' بات کرتے ہوئے اس کا دم پھولنے لگا تھا۔

'ارے مجھے پتہ ہی نہیں چلا، کم از کم فون ہی کروا دیتے' بلااختیار میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دبایا۔

'مجھے پتہ ہے تم فوراً آجاتے۔ لیکن میں چاہتا ہوں تم اس وقت فرخندہ بھابی کو پورا وقت دو۔ تم نے انھیں بتا دیا۔'

میں چپ رہا۔

'چلو اچھا ہے، اب مزید چھپانے سے کیا حاصل۔ بس فرخندہ سے کہنا مجھ سے بہت ناراض نہ ہوں۔ کاش یہ میرے بس میں ہوتا کہ میں کسی غیرجنس کی طرف راغب ہوں۔ تمھیں کیا پتہ یہ ساری زندگی کیسے عذاب میں گزری ہے۔ جسمانی عذاب آسان ہوتا ہے، نظر آجاتا ہے۔ لیکن روح کا کرب بہت تنہا ہوتا ہے، اکیلے جھیلنا پڑتا ہے۔' محمود تو شاید صرف اداس تھا میں رو دینے کو تیار تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم دونوں نے کھل کر اس موضوع پر بات کی تھی۔

'یہ کیسا عذاب ہے کہ اپنے والدین، رشتہ داروں اور بیشتر دوستوں سے بھی شیئر نہیں کرسکتا۔ میرے دل میں بھی لڑکیوں کو دیکھ کر شگوفے پھوٹنے لگتے تو آج یہ نوبت نہ آتی۔'

'محمود تم چاہو تو میرے ساتھ گھر چلو۔ یہاں اس حال میں تمھیں میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا' مجھے اپنی آواز اجنبی لگی لیکن مجھے خوشی ہے کہ میرے منہ سے یہ جملہ نکل ہی گیا۔

'طاہر، تمھیں نہیں معلوم تمھارے اس جملے سے میری آدھی بیماری دور ہوگئی۔ نہیں یار۔ ابھی نہیں، پھر کسی وقت۔ لیکن یہ وعدہ ہے کہ کوئی مسئلہ ہوا تو میں تمھیں ضرور بتاؤں گا۔ دیکھو تمھارے آنے سے کتنا فرق پڑا ہے۔ تم صحیح کہہ رہے تھے۔ گھر صاف کیا، شیو بنایا تو ذرا دھیان بٹ گیا۔'

میں محمود سے رخصت لے کر چلا آیا۔ میرے دل میں ایک کانٹا سا کھٹک رہا تھا۔ بعض

دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ قدرت آپ سے وہ کام کروا لیتی ہے جس کی بظاہر کوئی وجہ اور تاویل نظر نہیں آتی۔ نجانے کس جذبے یا خوف کے تحت میں بھی اپنے ڈاکٹر کے کلینک جا پہنچا اور ایڈز کا ٹیسٹ کروانے کی درخواست کی۔

'میں ضرور کر دیتا ہوں یہ ٹیسٹ، لیکن کیا آپ کو امید ہے کہ یہ ٹیسٹ پازیٹیو آئے گا؟' ڈاکٹر نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں، میں کچھ بوکھلا سا گیا۔ غیر متوقع سوال تھا اور میں جواب کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ حالانکہ مجھے یقین ہے میرے لاشعور میں وہ جواب موجود تھا، جب ہی میرے دل کی یہ کھٹک بھی مجھے یہ ٹیسٹ کروانے یہاں لے آئی تھی۔ ڈاکٹر میری خاموشی سے نجانے کیا سمجھا لیکن پھر اس نے یہ سوال نہیں دہرایا۔

'خون کے اس ٹیسٹ کا نتیجہ دو تین دن کے بعد آئے گا۔ میں فون پر یہ رزلٹ نہیں بتاتا، آپ کو خود آنا ہوگا' ڈاکٹر نے ٹیسٹ ٹیوب پر میرا نام لکھ کر ٹیوب کو ایک پلاسٹک کی تھیلی میں بند کیا، ہاتھوں سے دستانے اتارے اور مجھے فارغ کیا۔

محمود سے ملنے کے بعد میں کمپیوٹر پر ایڈز سے متعلق پڑھنے لگا تھا۔ اگر جلدی معلوم ہوجائے، تو اب تین دواؤں کے ایک ساتھ استعمال سے مریض تقریباً صحت یاب رہتا ہے۔ گو وائرس اس کے جسم میں گھومتا رہتا ہے۔ اس ابتدائی حالت میں یہ HIV پازیٹیو کہلاتا ہے۔ ایڈز اس کو اس وقت کہا جاتا ہے جب مریض کو اس بیماری سے وابستہ چند مخصوص بیماریوں میں سے کوئی ظاہر ہو۔ ورنہ ممکن ہے مریض ساری زندگی HIV پازیٹیو رہے اور ایڈز کی بیماری اسے نہیں چھوئے۔ عموماً خون کا رزلٹ ایک دن میں آجاتا ہے لیکن اگر نتیجہ پازیٹیو ہو تو پھر اسے دوبارہ ایک اور طریقے سے کنفرم کرتے ہیں جن میں مزید دو تین دن لگ سکتے ہیں۔

دوسرے دن میں نے کلینک فون کیا تو نتیجہ تیار نہیں تھا۔ میرا دل ڈوب سا گیا، یا اللہ کیا رزلٹ پازیٹیو ہے۔ کیا اسے دوسرے طریقے سے کنفرم کیا جا رہا ہے۔ اگلے دو دنوں تک میری نیند اڑی رہی۔ ہماری شادی کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ ان تین دن میں نے فرخندہ سے رجوع بھی نہیں کیا۔ بس دل میں ایک خلش سی تھی جس نے باز رکھا۔ فرخندہ کے سامنے میں نے سر درد کا بہانہ بنا دیا۔

میں دفتر میں تھا جب محمود کے انتقال کی خبر آ گئی۔ مرا محمود تھا جان میرے جسم سے نکل گئی۔ سب دوا علاج کے باوجود محمود اتنی جلدی نکل لیا۔ ذہن کے کسی گوشے میں ابھی اپنے خون کے ٹیسٹ کا بھی انتظار تھا۔ میرے جذبات اپنے دوست کی میت اور اپنے مذہبی عقائد کے درمیان کش مکش کا شکار تھے۔ دفتر سے جلدی رخصت لے کر محمود کے گھر گیا تو میت ہسپتال سے گھر آ چکی تھی۔ یہاں عذاب کا ایک دوسرا مرحلہ میرا منتظر تھا۔ محمود کی میت کو اس کے سفرِ آخرت تک لے جانے کے لیے شرمناک حد تک کم لوگ تھے۔ اس کے اعزّہ، احباب اور ملنے والوں نے ازخود حساب کتاب کر کے فیصلہ صادر کر دیا تھا۔

'یہ کام تو اوپر والے نے اپنے لیے رکھ چھوڑا تھا؟' میں نے دل میں سوچا۔

ذہن میں پھر اپنے خون کے ٹیسٹ کا خیال آیا تو جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ محمود کو سپردِ خاک کر کے گھر پہنچا تو فرخندہ بھی بہت اداس اور دُکھی نظر آئی۔ ایک لمحے کو تو بلک کر مجھ سے لپٹ کے رو پڑی۔

'اللہ مغفرت کرے، وہ بڑا معاف کرنے والا ہے' فرخندہ نے دھیرے سے کہا اور پلٹ گئی۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا اس نے یہ جملہ اللہ سے کہا تھا یا مجھ سے؟

'ارے ہاں وہ ڈاکٹر کے ہاں سے فون آیا تھا، آپ نے کوئی خون کا ٹیسٹ کروایا تھا۔ نرس کہہ رہی تھی ڈاکٹر نے کل آپ کو بلایا ہے۔ ظاہر آپ نے مجھے بتایا ہی نہیں، کوئی کولیسٹرول وغیرہ کا ٹیسٹ ہے کیا، مجھ سے تذکرہ تک نہیں، سب خیریت تو ہے؟'

'ارے ہاں فرخندہ بس وہی سالانہ چیک اپ۔ آج کل ڈاکٹر مریض کو آمنے سامنے بٹھا کر ہی بات کرتے ہیں، کل چلا جاؤں گا' میں نے لاپرواہی کا مظاہرہ کیا۔ دل اندر سے بہت خوفزدہ اور بے چین تھا۔ اک عجب بے کلی نے آلیا تھا۔

'میں ابھی آتا ہوں تھوڑی دیر میں' میں فرخندہ سے بہانہ کر کے گھر سے باہر چلا آیا۔ اب مزید میں انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ گھر سے نکل کر تیزی سے ڈاکٹر کے کلینک جا پہنچا۔ مجھے نہ جانے کیوں نرس کی آنکھوں میں ترحم کی جھلک نظر آئی۔ آدمی کیسا وہمی ہو جاتا ہے، میں نے اپنے آپ

کو تسلی دی۔ اس نے دروازہ کھول کر مجھے معائنہ کمرے میں بٹھا دیا۔ بہ مشکل دس منٹ بعد ڈاکٹر صاحب فائل لے کر کمرے میں آ گئے۔ یہ دس منٹ جو مجھے دس گھنٹے لگے، ان میں ذہن میں کیا کیا خیالات آئے، یہ ایک علیحدہ کہانی ہے۔

'کیسے مزاج ہیں طاہر صاحب؟'

'ٹیسٹ رزلٹ کیا آیا ہے' میں فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچنا چاہتا تھا، سیلاب آنا ہی ہے تو جتنی جلدی پتہ چل جائے اتنا اچھا ہے۔

'مجھے افسوس ہے طاہر صاحب، میرے پاس اچھی خبر نہیں ہے' ڈاکٹر صاحب نے میری بے صبری کا فائدہ اٹھا کر فوراً معاملہ نبٹا دیا۔ وہ خود بھی غالباً کسی بہانے کی تلاش میں تھے کہ کیسے مریض کو عمر قید کی سزا سنائیں۔ میرا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ میرے پاس اس وقت ڈاکٹر کی مشکلات اور اس کے پیشے کی پیچیدگیاں سوچنے کے لیے بالکل وقت نہیں تھا۔ ذہن کا ایک گوشہ غالباً اس نتیجے سے پہلے ہی واقف تھا۔ لیکن میں جانتے بوجھتے بھی اس امید میں تھا کہ کسی طرح معجزاتی طور پر یہ تلخ حقیقت جھوٹ ثابت ہوگی۔

'اب کیا ہوگا' یہ شاید میری ہی آواز تھی۔

'دیکھیے مرض بہت ابتدا میں ہی تشخیص ہو گیا ہے۔ ہم تین مختلف دواؤں سے علاج شروع کریں گے اگلے پندرہ بیس سال تک تو انشاء اللہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ مجھے اس کا اس وقت انشاء اللہ کہنا ایسا لگا جیسے میرا مذاق اڑا رہا ہو۔ یا شاید وہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا پکڑا رہا تھا۔

'اب سب کو پتہ چل جائے گا' دل کی بات زبان پر آ ہی گئی۔ میں زیادہ خوفزدہ کس بات سے تھا، خود بیماری سے یا اس کی خبر عام ہونے سے؟

'صرف HIV پازیٹیو ہونے کی کوئی علامت نہیں ہے۔ اور اگر آپ نے باقاعدہ علاج کرایا تو اگلے پندرہ بیس سال ایڈز سے متعلق کوئی بیماری آپ کو نہیں ہوگی، بس آپ کو خود ذرا احتیاط کرنی ہوگی۔'

'ہاں ایک بات اور ہے' ڈاکٹر کے لہجے میں ہچکچاہٹ تھی۔

'ابھی اور عذاب آنے باقی ہیں' میں نے دل میں سوچا، خالی خالی نظروں سے ڈاکٹر کو

دیکھتا رہا۔ ذہن جو سن رہا تھا اس میں سے کتنا قبول کر رہا تھا یہ ایک مختلف بات تھی۔

'آپ کو اپنی بیوی کا بھی ٹیسٹ کروانا چاہیے۔'

'بیوی کا ٹیسٹ۔۔۔' کون سی سزا زیادہ کڑی تھی، خون کے ٹیسٹ کا نتیجہ یا بیوی کو یہ اطلاع پہنچانا۔۔

'میں یہ بات کر سکتا ہوں آپ کی اہلیہ سے' ڈاکٹر صاحب میرے چہرے سے سب پڑھ رہے تھے۔

'نہیں یہ پلِ صراط مجھے خود ہی عبور کرنا ہوگا، بس دعا کیجیے گا راستے میں گر نہ پڑوں۔'

گھر پہنچا تو فرخندہ منتظر تھی۔

'کہاں چلے گئے تھے آپ بغیر بتائے، اتنی دیر لگا دی، کب سے کھانا گرم کیے بیٹھی ہوں' اس نے لگاوٹ سے شکایت کی۔ لڑنے، جھگڑنے والی بیوی ہوتی تو معاملہ آسان تھا۔ اب اس محبت کرنے والی ساتھی کو کیا بتاؤں۔ اور پھر تشخیص بتانے کے مرحلے سے گزر بھی جاؤں تو اس کے بعد کے سوالات بہت جان لیوا ہوتے۔ صرف ایک سوال، ایک ہی سوال 'کیسے'، یہ کتنا بڑا امتحان ہوگا، جب وہ پوچھے گی کہ یہ کیسے ہوا تو کیا بتاؤں گا۔

'کیا بات ہے طاہر' فرخندہ میرے ہر مزاج، ہر موسم سے آشنا تھی۔

'فرخندہ دراصل میں ڈاکٹر کی طرف گیا تھا۔'

'اچھا تو کیا کولیسٹرول کا نتیجہ خراب نکل آیا۔ چلیں کل سے دونوں تلے ہوئے کھانے، بڑے کا گوشت، سب بند بس اب صرف سبزیاں ملا کریں گی، میں بھی وزن کم کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھی' فرخندہ کی ہنسی میں ایک اطمینان کی جھلک تھی، 'آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔'

'فرخندہ مجھے HIV ہے۔'

'آپ کو کیا ہے؟' فرخندہ جو پچھلے چند ماہ میں HIV کے متعلق اتنا کچھ پڑھ چکی تھی سن کر بھی نہ سن سکی۔

'مجھے HIV ہے' میں فرخندہ کی طرف دیکھ بھی نہ سکا۔

'لیکن۔۔' فرخندہ نے سب سے اہم سوال ادھورا چھوڑ دیا اور پھر جیت گئی۔ پوچھتی کیوں

نہیں، مجھے ذلیل کیوں نہیں کرتی۔شاید' کیسے' پوچھ کر وہ مجھے یا اپنے آپ کو شرمندہ نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ بس ایک دم خاموش ہوگئی۔ میں اس کی نظریں نہیں بھول سکتا، کیا کچھ نہیں کہہ گئی وہ ایک نظر۔مر جانا آسان ہوتا تو شاید یہی لمحہ تھا مر جانے کا۔

'میرا ٹیسٹ کروانا ہے' فرخندہ کا لہجہ سپاٹ تھا۔

'ہاں فرخندہ، میں بہت شرمندہ ہوں، مجھے معاف کردو'، میں نے اس کے شانے پکڑ لیے، اپنی طرف گھما تو لیا لیکن آنکھیں نہیں ملا سکا۔

'شاید میرا ہی قصور ہو۔ اگر میں ہی سب کچھ فراہم کرسکتی تو کہیں اور جانے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔' یا اللہ یہ کیسی مخلوق ہے اب بھی خود ہی کو الزام دے رہی ہے۔فرخندہ نے اپنے شانے پر سے میرے ہاتھ بہت نرمی سے علیحدہ کیے اور اندر کمرے میں چلی گئی، میں وہیں کھانے کے کمرے میں بیٹھا رہ گیا۔ اگلے دن تک ہمارے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ وہاں غرور ٹوٹنے کا غم تھا تو یہاں اپنی کم ظرفی کا قلق۔

'چلیے ڈاکٹر کے ہاں' دوسرے دن فرخندہ خود ہی تیار ہوکر آ کھڑی ہوئی۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ خاموش احتجاج کتنا باوقار اور طاقتور ہوتا ہے۔

معائنے کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے فرخندہ نے میری طرف مڑ کر کہا 'آپ باہر انتظار کیجیے۔' فرخندہ کی زندگی سے باہر بیٹھ کر اس کا انتظار ایک نئی چوٹ تھی، لیکن یہ حالات خود میرے پیدا کیے ہوئے تھے، بس ڈر یہ تھا کہ اب ہمیشہ یہ انتظار باہر ہی بیٹھ کر نہ ہو۔

فرخندہ کے ٹیسٹ کا نتیجہ تین دن بعد آیا تو یہ قیامت پہلی قیامت سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ اب ہم دونوں ہی ایک ڈوبتی کشتی کے مسافر تھے اور اس کشتی میں سوراخ میرا اپنا کیا ہوا تھا۔ میرے ٹیسٹ رزلٹ پر فرخندہ روئی ہو یا نہیں لیکن اپنے رزلٹ پر اس نے ایک آنسو نہ بہایا۔ ڈاکٹر نے ہم دونوں کو ساتھ بٹھا کر بہت تفصیل سے بیماری کی جزیات سے آگاہ کیا، بہت امید دلائی، دوائیں بہت باقاعدگی سے لینے کی ہدایت کی۔

'ایک اہم بات یہ ہے کہ آپ کے ہونے والے بچے کا بھی کل ٹیسٹ ہوگا۔فرخندہ کے

پیٹ کے راستے بچے کے خون کا نمونہ نکال کر ٹیسٹ کے لیے بھیج دیں گے، دو تین دنوں میں یہ نتیجہ بھی آجائے گا' اس ایک ہفتے میں، میں نے پہلی بار فرخندہ کے چہرے پر زلزلے کے آثار دیکھے اور آنسو اس کا دامن بھگونے لگے۔ میں نے تسلی کی خاطر اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا تو اس نے بدن چرایا نہیں بلکہ میرا ہاتھ وہیں رہنے دیا۔

یہ تین دن ہم نے کانٹوں پر گزارے۔ فرخندہ ابھی تک مجھ سے بات نہیں کر رہی تھی۔ پہلے ایک ہفتہ ہم الگ کمروں میں سوئے تھے۔ جب سے بچے کے خون کا نمونہ ہوا تھا، فرخندہ نے کمرہ چھوڑ کر دوسرے کمرے میں سونا بند کر دیا تھا، لیکن ہمارے درمیان شرمندگی کی دبیز کہر ابھی اتنی ہی گہری تھی۔

ہم دونوں ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے سامنے بچھی دو خالی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ دیا۔ فرخندہ کرسی کے کنارے پر بے چین سی ٹک گئی، دونوں کہنیاں ڈاکٹر کی میز پر ٹکی، وہ کسی بھی نتیجے کے لیے تیار لگتی تھی۔

'میرے پاس آپ کے لیے بہت اچھی خبر ہے۔ بچے کے ٹیسٹ کا نتیجہ منفی آیا ہے۔'

فرخندہ کے چہرے پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی اور آنکھوں سے پھر ساون بھادوں بہنے لگا، عجیب پاگل ہوتی ہیں یہ عورتیں بھی۔

'یہ بہت اچھی خبر ہے، میں آپ دونوں کے۔۔۔' ڈاکٹر پتہ نہیں اور کیا کیا کہتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ کرسیوں کے درمیان فرخندہ نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا ہے۔

'چلیں' فرخندہ نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ 'اب ہمیں اس نئی زندگی کے لیے جینا ہے'۔

کلینک سے باہر نکل کر فرخندہ میری طرف مڑی۔ 'اب میں آپ سے جو سوال پوچھوں گی اس کا بہت سوچ کر جواب دیجیے گا، کہ ہمارے آئندہ تعلقات کا انحصار آپ کے جواب پر ہے۔'

'اگر میرا ٹیسٹ کروانا ضروری نہیں ہوتا تو کیا آپ مجھے اپنے ٹیسٹ کا نتیجہ اس دن بتا دیتے؟' فرخندہ کے لہجے میں ایک چیلنج تھا، میں اب تک اس سوال کے درست جواب کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔

مولوی عبدالحق

جوانی سب پر آتی ہے، مگر بعض پر ایسی کہ نظر جما کر دیکھ لو تو ایمان ہاتھ سے جا تا رہے۔
حمیدہ کا بھی یہی حال تھا۔ جہاں جہاں بھرائی کی ضرورت تھی بس وہیں پر خوب تھوپ تھوپ کر بھرا ہوا جسم۔ لمبی چوٹی ایسی کہ حمیدہ چلتی تو چوٹی بھی اس کے سرین کے ساتھ ط ظ، ط ظ کرتی۔ اس کی ناک میں جڑی چاندی کی کیل ایسے چمکتی گویا بتی جل بجھ کر اپنے ہونے کا اشارہ دے رہی ہو۔ بس حمیدہ اپنے بخت سے مار کھا گئی۔ لوگوں کے گھروں میں جھاڑو پوچا کرتے اب آٹھ برس ہونے کو آرہے تھے۔ تیرہ برس کی عمر میں ہی اس کی ماں رابعہ ماسی نے اسے ایسے گھروں پر رکھوا دیا تھا جہاں جوان لڑکے نہ ہوں۔ پھر مولوی عبدالحق تو پیش امام تھے، اپنی ایک نوعمر بیٹی اور بیوی کے ساتھ فیصل آباد کے اس چھوٹے سے محلے میں چین کی لکھ رہے تھے۔ منہ پر لمبی ڈاڑھی اور سر پر ٹوپی ایسے جمی تھی جیسے سریش سے چپکا دی ہو اور کاندھے پر ایک بڑا چوخانے والا صافہ۔ محلے میں عبدالحق کی بہت عزت تھی۔ دو کمروں کا ایک اسی گز پر بنا گھر تھا جس میں عزت سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ دو کمرے، چھوٹا برآمدہ اور ایک صحن۔ برآمدے اور صحن کے درمیان ایک غسل خانہ اور باورچی خانہ۔ اور پھر تین بندوں کی ضروریات بھی کیا۔ پھیلاؤ تو خیر محل بھی ناکافی ہو۔ لیکن عبدالحق اور اس کا خاندان بڑے سکون کے ساتھ اس گھر میں رہ رہا تھا۔

بیوی بہت سگھڑ تھی جس نے اس مکان کو گھر بنا رکھا تھا۔

'حمیدہ تم نے باتھ روم صاف کر لیا' عائشہ نے حمیدہ سے پوچھا۔ عائشہ خود ماشاء اللہ اب تیرہ برس کی تھی۔ آج جمعے کی چھٹی کی وجہ سے صبح سے گھر پر تھی، ورنہ عموماً اس وقت اسکول میں ہوتی۔ دوسرے اسکول والوں کی نسبت حمیدہ عائشہ کو زیادہ پسند کرتی تھی اور بے تکلفی سے بات کر لیتی۔ عبدالحق اور ان کی بیوی سعیدہ تو اسے کوئی چیز چھونے ہی نہ دیتے۔ بس غسل خانے، جھاڑو اور پوچے کی اجازت تھی۔ کسی اور چیز سے اس کا ہاتھ مس تو اسے پاک کیا جاتا۔

'جی عائشہ بی بی صاف کر لیا ہے آپ استعمال کر لیں' حمیدہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

سعیدہ کو اس کی مسکراہٹ سے بہت خوف آتا تھا، کم بخت مسکراتی تو بالکل پھول بن جاتی تھی۔ سعیدہ بھونروں کی آنکھوں پر موم ٹپکاتی پھرتی۔

'یہ کام کرنے والیوں کو بھلا خوبصورت ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے' انھوں نے سنجیدگی سے سوچا۔ 'گھر کے کام کاج کو وہ ہی اچھی ہے جو رنگت کی کالی اور ناک نقشے کی بے ہنگم ہو۔'

'حمیدہ باہر کے کمرے میں آج پوچا ضرور لگا دینا، جمعے کا دن ہے، مولوی صاحب سے ملنے لوگ آئیں گے نماز کے بعد۔'

سعیدہ یہ ہدایات دے کر باہر کے کمرے میں عبدالحق کے پاس چلی آئی، جو اس وقت اخبار کے پیچھے چھپے بیٹھے تھے۔

'حمیدہ نے غسل خانہ صاف کر دیا ہے، عائشہ نکلے تو آپ جا کر نہا لیں، ورنہ نماز کو دیر ہو جائے گی' سعیدہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

'ہاں نہا لیتا ہوں' عبدالحق نے اخبار نیچے کیا۔ جب تک حمیدہ کام کرتی عبدالحق اخبار پڑھتے رہتے۔ اخبار کی اوٹ میں دیدوں کا پردہ ہو جاتا نہ، دیدے کہاں گھوم رہے ہیں نظر آئیں گے تو پتہ چلے گا ناں۔

'سعیدہ یہ ٹکڑا کاٹ کر اوپر طاق پر رکھ دو۔ بے وقوف اخبار میں آیتیں چھاپ دیتے ہیں۔ پرچہ کہیں زمین پر پڑا ہے کبھی کسی کے ہاتھ میں ہے، کچھ خیال نہیں بے حرمتی کا۔'

قرآنی آیات جہاں کہیں اخبار یا رسالے میں چھپی نظر آتیں، سعیدہ انھیں کاٹ کر چومتی، آنکھوں سے لگاتی پھر طاق میں رکھ دیتی۔ سال چھ مہینے میں یا تو انھیں دفنا دیا جاتا یا موقع ہوتو صاف بہتے پانی میں بہا دیتے کہ پاکی سے پاکی مل جائے۔ سعیدہ قینچی لینے اپنے کمرے کی طرف نکل گئیں۔ حمیدہ باقی کام ختم کر کے بالٹی اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ پائینچے اونچے کر کے شلوار کے نیفے میں اڑسے ہوئے۔ شفاف پنڈلیوں پر عبدالحق کی نظریں جم سی گئیں۔ بالٹی کے بوجھ سے کمر ایک طرف لوچ کھا گئی تھی، جیسے پھولوں سے لدی شاخ اپنے وزن سے جھک جائے۔ عبدالحق نے پیر سمیٹ کر کرسی پر رکھ لیے اور اکڑوں بیٹھ گئے تاکہ پیر یا دھوتی ناپاک نہ ہوجائیں۔ اخبار بدستور ناک کے آگے دھرا تھا۔

'حمیدہ دیکھ وہ کونا تو نے چھوڑ دیا ہے' بات کسی طرح تو شروع کرنی تھی۔

'جی' حمیدہ نے نگاہیں نیچی رکھیں اور اس کونے پر دوبارہ پوچا لگادیا جہاں ابھی چند لمحے پہلے ہی ہاتھ پھیر چکی تھی۔ عبدالحق سے اسے بہت الجھا دینے والے سگنل ملتے تھے۔ اپنی چھٹی حس کو کیسے جھٹلاتی۔ دوسری طرف عبدالحق کی شرافت اور مذہبی مقام سے بھی واقف تھی۔ وہ خود اپنے گرجا کے پادری کی شفقت دیکھ چکی تھی۔ لیکن عبدالحق سے اسے نہ جانے کیوں بہت ڈر لگتا۔ اسے نہیں یاد اس نے کبھی عبدالحق سے نظریں ملائیں ہوں۔ بعض نظریں احساس کو ننگا کردیتی ہیں اور بعض نگاہیں انسان کے جسم کو۔ عبدالحق کی نگاہیں بعدالذکر گروہ کی تھیں، سرمہ لگا کر اور قاتل بن جاتیں۔

'اب تو بھی کلمہ پڑھ کر سچائی قبول کرلے عاقبت سنور جائے گی' عبدالحق نے اخبار نیچے کر کے تنبیہ کی۔

'بس مولوی صاحب ایسے ہی ٹھیک ہے' حمیدہ یہ سوال پہلے بھی کئی مرتبہ ٹال چکی تھی۔ ہر دفعہ یہ سوال اس کے جسم میں سردی کی ایک پھریری سی دوڑا دیتا۔

'خاک ٹھیک ہے۔ اس یسوع مسیح کے چکر میں بلاوجہ جہنم میں جائے گی۔ اچھے بھلے نبی کو خدا کا بیٹا بنا دیا۔ تجھے ڈر نہیں یہ جسم جہنم میں جلایا جائے گا' عبدالحق نے جہنم میں جلنے والے اس جسم کا ایسے بغور معائنہ کیا جیسے جلنے سے پہلے آخری دفعہ دیکھ رہے ہوں۔

'بس مولوی صاحب ایسے ہی ٹھیک ہے، کام چل تو رہا ہے' حمیدہ نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

'کہاں چل رہا ہے۔ کلمہ پڑھ لے تو دو بول پڑھ کر کسی شریف آدمی کے ساتھ بندھ جا، کب تک یہ جھاڑو پھیرتی رہے گی۔'

'ارے مولوی صاحب' حمیدہ بلاوجہ شرما گئی۔ اسے عبدالحق کی نگاہوں کی گرمی جسم کے مختلف گوشوں میں چبھتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سینے پر دوپٹہ ٹھیک کیا۔ حمیدہ کا ہاتھ تیزی سے چل رہا تھا کام ختم ہو تو نکلے یہاں سے۔

'بس تو ایک بار کلمہ پڑھ لے۔ پھر دیکھ میں کس سے تیرا ساتھ جوڑتا ہوں۔ ارے کنوارا نہ ہوا کوئی تجربہ کار کیا برا ہے' مولوی عبدالحق اندھیرے میں تیر چلانے میں مشاق تھے کوئی نشانہ خود سے چلے ہوئے تیر کے سامنے آجائے تو کیا بات ہے۔

سعیدہ قینچی لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو حمیدہ کی سانس واپس آئی۔ عبدالحق کا اخبار واپس اوپر کی سمت سرک گیا۔ پوچا تقریباً ہو چکا تھا، بالٹی اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔

'ابھی دومنٹ کرسی سے نہ اتریں گیلے فرش پر قدموں کے نشان رہ جاتے ہیں' نہ جانے کیوں عبدالحق کو بیوی کا لہجہ معنی خیز لگا۔

'حمیدہ یہ کوڑا بھی نکال دے میرے کمرے سے' عائشہ نے اس کو یاد دلایا۔ ایک خالی تھیلی لے کر حمیدہ عائشہ کے کمرے میں گھسی۔ چہرے کا روہانسا پن عائشہ سے نہ چھپ سکا۔

'کیا ہوا؟ مولوی صاحب سے ڈانٹ پڑی' عائشہ نے ہنس کر پوچھا۔

'نہیں کہہ رہے تھے کلمہ بھرلو۔'

'کلمہ بھرلو؟'

'ہاں مطلب مسلمان ہو جاؤ، میں کرسچن ہوں ناں عائشہ بی بی۔'

'ارے تو پڑھ لو کلمہ کیا فرق پڑتا ہے، پر مسلمان تو سارے جنت میں جائیں گے' عائشہ نے بھولپن سے کہا۔

'نہ بی بی۔ ہمارا فادر بھی یہی کہتا ہے کہ اصل میں تو سارے کرسچن جنت میں جائیں گے، کلمہ پڑھ لیا تو پھر کرسچن نہ رہوں گی۔'

'اچھا۔ تو پھر مت پڑھو۔ اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے' عائشہ کی عمر میں ہر بات سادہ اور دوٹوک ہوتی ہے۔

'بس ایسے ہی عائشہ بی بی اخباروں میں خبریں لگتی ہیں تو بہت ڈر لگتا ہے۔ پھر ماں تو کہتی ہے مذہب سارے اچھے ہوتے ہیں، مسلمان بھی بہت اچھے ہوتے ہیں، ضروری تو نہیں سب کرسچن مسلمان ہو جائیں' حمیدہ نے اداسی سے کہا۔

'چلو اچھا اب میرے کمرے کا کوڑا نکالو مجھے اپنا ہوم ورک بھی ختم کرنا ہے۔'

نہا دھو کر مولوی عبدالحق نے اجلے، صاف کپڑے پہنے اور مسجد چل پڑے۔ ابھی چند ہی نمازی جمع ہوئے تھے۔ سب سے ہاتھ ملایا، خیریت پوچھی۔ اکثر نمازیوں سے وہ ذاتی طور پر واقف تھے۔ عبدالحق صوم وصلوٰۃ کے پابند، عاشقِ رسول تھے۔ ختمِ نبوت کی تحریک میں لاٹھیاں کھائی تھیں۔ پھر بھی انھیں فخر تھا کہ ختمِ نبوت کے منکروں سے وہ نہ دبے نہ پیچھے ہٹے۔ اپنے عقیدے اور قربانیوں کا ذکر وہ اکثر خطبوں میں بیان کرتے۔ پنجاب کے اکثر دیگر خطیبوں کے برعکس لہک لہک کر ترنم سے خطبہ دینے کے بجائے گرجدار آواز میں تحت اللفظ میں مسلمانوں کو ان کے فرائض یاد دلاتے رہتے۔ آج بھی جمعہ کا وقت ہونے تک مسجد نمازیوں سے بھر گئی۔ صفیں درست کرا کے نماز کی امامت کی۔ خطبہ میں آج زور ناموسِ رسالت پر تھا۔ سویڈن کے ایک اخبار میں حال ہی میں گستاخانہ اور اشتعال انگیز کارٹون شائع ہوئے تھے۔ جس نے عبدالحق کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ انھوں نے خطبے میں اس کا اجمالی جائزہ لیا۔ ان کے لہجے کی کاٹ، جملوں کی گرمی اور زورِ خطابت نے لوگوں کے دل برما دیے۔ اپنے عقیدے کی توہین اور بے حرمتی سے لوگوں کے دل لہو رو دیے۔ عبدالحق سیدھے سادھے مسلمانوں کے جذبات سے ایسے کھیلتے رہے جیسے ایک بچہ گیند ہوا میں اچھال اچھال کر جب چاہے پکڑ لے جب چاہے چھوڑ دے۔

نماز کے بعد عبدالحق بہت سے نمازیوں سے گلے ملے۔ مجمع کم ہوا تو یہ بھی مسجد سے باہر نکلے اور گھر کی جانب چل پڑے۔ گھر کوئی ایک فرلانگ کی دوری پر تھا۔ سیدھی، پکی سڑک پر کوئی دو سو گز چلنے کے بعد داہنی ہاتھ پر مڑیں، پھر اندر ہی اندر دو تین گلیاں۔ تیسری گلی میں

سیدھے ہاتھ پر نکڑ سے چوتھا مکان عبدالحق کا تھا۔ سیدھی پکی سڑک سے مڑے ہی تھے کہ حمیدہ نظر آ گئی۔ عبدالحق کی سڑک اچانک ناہموار ہوگئی۔ حمیدہ شفیق صاحب کے گھر کام ختم کر کے نکلی تھی اور اب اپنی جھونپڑی بستی کا رخ تھا۔ حمیدہ کے ہاتھ میں کچھ اخبار کے پھٹے ٹکڑے دور سے نظر آ رہے تھے۔

'ارے تو کب سے پڑھنے لگی' عبدالحق نے اخبار کے ٹکڑے دیکھ کر پوچھا۔

'مولوی صاحب یہ شفیق صاحب کے گھر جھاڑو میں آ رہے تھے، میں نے اٹھا لیے۔ اس پر آپ کا وہ کلام لکھا ہے جسے آپ حفاظت سے رکھوا دیتے ہیں۔ میں نے اٹھا لیے کہ کل بیگم صاحبہ کو دے دوں گی تا کہ اس کی بے عزتی نہ ہو۔' حمیدہ نے گھبرا کے اخبار کے ٹکڑے عبدالحق کی طرف بڑھا دیے۔

'اری نجس تو نے یہ آیتوں کو ہاتھ لگا دیا' عبدالحق نے غصے سے حمیدہ کے ہاتھ سے اخبار کے وہ ٹکڑے چھین لیے۔

'ناپاک کر دیا تو نے ہمارے کلامِ پاک کو' عبدالحق کی آواز بلند تھی، جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔ کچھ نمازی جو گھر کو آ رہے تھے، رک گئے۔ چند لوگ قریب آ گئے۔ ایک صاحب نے ہاتھ بڑھا کر اخبار کا ٹکڑا عبدالحق کے ہاتھ سے لے لیا۔

'ارے کم بخت، کرسچن، تیرا کلامِ پاک سے کیا کام، جلانے جا رہی تھی کیا؟'

جلد ہی ایک چھوٹا سا مجمع لگ گیا۔ حمیدہ اس گرداب کے عین وسط میں سہمی کھڑی تھی۔ اسے اپنی روح اس گرداب میں دھنستی محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی تک کسی نے اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ بس غنیمت ہی تھا کہ کسی نے پہل نہیں کی تھی۔ عبدالحق کا خطبہ ابھی لوگوں کے خون میں گردش کر رہا تھا اور یہ لاوا کسی بھی لمحے پھٹ کر حمیدہ کو بھسم کر سکتا تھا۔

'چلیں جانے دیں جی۔ وہ کہتی ہے کوڑے سے اٹھائے تھے یہ ٹکڑے تا کہ بے حرمتی نہ ہو' ایک کلین شیو، پتلون قمیض میں ملبوس صاحب نے صلاح دی۔ بشرے سے تعلیم یافتہ لگتے تھے۔

'لو اس کے حمایتی بھی پیدا ہونے لگے، کیا تعلق ہے تمھارا اس سے۔ تمھیں کیا پتہ اس کا ارادہ کیا تھا۔ کیا تمھارے پاس کام کرتی ہے' مختلف آوازیں اس تواتر سے ابھریں، کہ وہ

صاحب غیر محسوس طریقے سے پیچھے ہٹتے ہٹتے اس دائرے سے باہر ہو گئے۔ اس جنون میں جو ایک آواز منطق اور انصاف کی ابھری تھی وہ انتہا پسندی کے شور میں دب گئی۔

'میں نے جی خود سنا ہے یہ اکثر ہمارے نبیوں کا بھی مذاق اڑاتی ہے۔' شہزادہ گلی کے نکڑ پر سائیکل کی دکان چلاتا تھا۔ کئی بار حمیدہ کو چھیڑا، آ گدی پر بیٹھ جا، آ تجھے سائیکل کی سواری کروا دوں۔' مگر وہاں انگور کھٹے ہی نکلے۔ اب سوچا حمیدہ کے دو چار جھانپڑ لگ جائیں گے تو اس کے حواس درست ہوں گے، کیا پتہ کچھ سہل بھی ہو جائے۔

'نبیوں کا مذاق اڑاتی ہے اور تو چپ چاپ سنتا رہا۔ کیا زمانہ آ گیا ہے۔ کیسے بے غیرت مسلمان ہیں۔ یہ سب قیامت کی نشانیاں ہیں' عبدالحق نے گلوگیر لہجے میں فریاد کی اور کاندھے پر پڑے انگوچھے سے آنکھیں صاف کیں۔ اس فریاد سے یہ ضرور ہوا کہ حمیدہ کی دبی دبی سسکیاں بلند آواز گریہ میں بدل گئیں۔ مجمع کا مذہبی جنون اب بیدار ہو چکا تھا، اور دلیل منطق یا رحم جیسے جذبات اس پر الٹی جلتی کا کام دے رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ مجمع بے قابو ہوتا کسی نے رائے دی کہ اسے پولیس کے حوالے کر دیا جائے تاکہ ناموسِ رسالت کی شان میں گستاخی کی قرار واقعی سزا ملے۔ حمیدہ کا رونا اب بین میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ مجمع کو اس کے خدا اور رسول کا واسطہ دے رہی تھی۔ اپنی بے گناہی کی قسمیں کھاتی، روتی جاتی تھی۔ مجمع اب بڑھ کر جلوس بن چکا تھا۔ ایسے میں کسی من چلے نے حمیدہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے سڑک کی طرف گھسیٹنا شروع کر دیا۔ حمیدہ نے اپنے پیر زمین پر ایسے گڑو دیے جیسے کوئی قربانی کا جانور مذبح خانے کو دیکھ کر جم جائے۔ اس سے لوگوں کا اشتعال اور بڑھ گیا۔ اب جو دو تین لوگوں نے مل کر گھسیٹا تو وہ زمین پر گر پڑی اور ان کے پیچھے گھسٹتی چلی گئی۔ اس طرح مجمع اس کو گھسیٹ کر تھانے تک لے آیا۔ یہاں تک آتے آتے کھال جگہ جگہ سے چھل چکی تھی اور کئی جگہ سے خون بہہ رہا تھا۔ کپڑے کئی جگہ سے پھٹ چکے تھے، آنسوؤں کا ذخیرہ بھی شاید خرچ ہو چکا تھا۔ اب اس کا دھول زدہ چہرہ، ماتھے پر خون کی پپڑیوں اور بالوں میں اڑتی خاک سے ایک ایسی تصویر پیش کر رہا تھا کہ تھانے دار کو یقین ہو گیا کہ اسے سلاخوں کے پیچھے فوراً نہ ڈالا تو مجمع اسے مار ڈالے گا۔

تھانے دار معاملہ فہم تھا۔ پچھلے بیس برس سے اسی تھانے پر معمور تھا۔ اس کا ایک سسرالی وزیر حکمران پارٹی کا جیالا ورکر نہ ہوتا تو بہت پہلے اس کی تبدیلی ہو چکی ہوتی۔ فیصل آباد میں اس محلے سے متصل صنعتی علاقہ تھا جو اسی تھانے کے دائرۂ اختیار میں آتا تھا۔ اس جغرافیائی حقیقت نے اس تھانے کو سونے کی کان میں تبدیل کر دیا تھا۔ تھانے دار علاقے کے اکثر معززین سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے عبدالحق کو پہچان کر انھیں سلام کیا اور ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ ایسی متبرک چیزیں بوسے سے گناہوں کو چوس کر سلیٹ پھر صاف کر دیتی ہیں۔

'کیا بات ہوگئی مولوی صاحب، آپ نے کیوں زحمت کی، مجھے بلوا لیا ہوتا۔'

'تھانے دار صاحب، اس بدبخت نے توہینِ رسالت کی ہے۔ اس جہاد میں حصہ لینا ہمارا فرض تھا۔ تھانے تک کا یہ سفر تو جنت کی کنجی ہے۔ اسے قرارِ واقعی سزا ملنی چاہیے۔' عبدالحق کا وقار، دبدبہ اور سکون دیدنی تھا۔ مسماۃ حمیدہ کی گریہ وزاری، اس کی ظاہری حالت، پھٹے کپڑے اور تشدد کے نشانات سے وہ بالکل بے نیاز نظر آتے تھے۔ جہاں دیدہ تھانے دار کے ماتھے پر فکر کی لکیریں نمودار ہوگئیں۔ معاملہ سنجیدہ تھا۔ اس کا خیال تھا چوری یا زنا کا کوئی معاملہ ہوگا، کچھ آمدنی کا ذریعہ بنے گا، مگر یہاں دریا ذرا زیادہ گہرا تھا اور مگرمچھوں کا راج۔

'اَبے نذیر، پرچہ کاٹ کر بند کر بھئی اسے۔'

نائب صوبے دار نذیر نے مسماۃ حمیدہ کو قانونِ پاکستان کی کئی دفعات کے بوجھ تلے دفن کر کے اس کی لاش کو سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا۔

'اب آپ لوگ جائیں، یہاں سے قانون کا لمبا ہاتھ انصاف سے معاملہ سنبھال لے گا۔'

تھانے دار نے رٹے رٹائے چند جملے دہرا دیے۔ کچھ لوگ سکون کا سانس لے کر چل پڑے۔ کچھ من چلے جو آس پاس منڈلا رہے تھے اور تماشہ ادھورا چھوڑنے سے گریزاں تھے انھیں نذیر نے ذرا دھمکا کے چلتا کیا۔ مولوی صاحب اور ایک دو معززین کو تھانے دار نے روک لیا۔

'مولوی صاحب معاملہ بہت سنجیدہ ہے۔ یہ بدبخت اپنی جان سے جائے گی' تھانے دار نے غور سے عبدالحق کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

'ایسے مردودوں کا یہی انجام ہونا چاہیے، کئی عینی شہادتیں موجود ہیں' عبدالحق اپنے موقف پر قائم تھے۔

'آپ تو مولوی صاحب ہیں اس مسئلے میں کوئی گنجائش نکلتی ہے تو ذرا غور کریں۔ میں اس کی برادری سے معاملہ کرلوں گا۔ مسجد کی تعمیر و آرائش میں بہتری آسکتی ہے۔' تھانے دار نے معنی خیز سے انداز میں ایک گول مول سا بیان داغ دیا۔'ایک دفعہ ایف آئی آر کٹ گئی تو معاملہ ہم دونوں کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔'

عبدالحق چپ تھے۔ ان کا تذبذب دیکھ کر تھانے دار کی ہمت بڑھی۔

'کوئی صورت تو ہوگی معافی کی مولوی صاحب؟'

'معافی کی گنجائش تو نکل سکتی ہے اگر یہ کلمہ پڑھ لے۔'

'کیا مطلب؟'

'مطلب یہ ہے تھانے دار کہ اگر یہ بدبخت کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائے اور سچے دل سے توبہ کر لے تو میرا مالک بڑا غفور الرحیم ہے وہ یقیناً اس کی لغزش کو معاف کرے گا۔'

تھانے دار کو لچک اور گنجائش ملی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

'آپ کی اجازت ہو تو ابھی میں پرچہ نہ کاٹوں۔ مجھے اس کو سمجھا لینے دیں، ہمارے سمجھانے سے تو لوگ دین کیا ولدیت تک بدل لیتے ہیں، پھر میں اس کی برادری سے بھی ذرا معاملہ کرلوں گا۔'

'ٹھیک ہے تھانے دار صاحب، یہ کلمہ پڑھ لے تو اس کا ثواب آپ کو بھی پار لگا دے گا' مولوی صاحب نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھا دیے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گھر لوٹ آئے۔

شام تک یہ خبر محلے تو کیا سارے شہر بلکہ صوبے بھر میں پھیل چکی تھی۔ متضاد خبریں تھیں۔ تھانے دار کا موقف یہ تھا کہ ابھی معاملہ صاف نہیں ہے۔ شہادتیں اکٹھا ہو رہی ہیں کہ مسماۃ حمیدہ مسجد سے چوری کر کے بھاگ رہی تھی یا جیسا کہ کچھ لوگ الزام لگا رہے ہیں، گستاخِ رسول ہے۔ تھانے میں وہ رات بہت مصروف رہی۔ تھانے دار کا خیال تھا معاملہ آسان ہوگا۔ حمیدہ کو نہانے کی اجازت دی گئی۔ اس کی چوٹوں پر لال دوا تھوپی گئی۔ کھانے کی ٹرے حمیدہ نے ویسے

ہی واپس کر دی۔ نذیر اور دو سپاہی جا کر بستی سے حمیدہ کے باپ اور دو تین رشتہ داروں کو بلا لائے۔ تھانے دار نے معاملہ صاف بیان کر دیا۔حمیدہ نے رسولِ خدا کی شان میں گستاخی کی ہے، کئی شہادتیں موجود ہیں، اس جرم کی سزا موت ہے۔ کوئی ماں کا لال، کوئی وکیل کوئی سیاستدان اس کو نہیں بچا سکے گا۔ بچنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ حمیدہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائے،توبہ کر کے معافی مانگے اور دو لاکھ کا جرمانہ تھانے دار کو ادا کرے، اس صورت میں یہ الزام بدل کر مسجد سے جوتا چرانے کی عام سی روایتی شکایت میں بدل سکتی ہے۔

تھانے دار نے پہلے حمیدہ کو سمجھایا، پھر دھمکایا، پھر ایک دو لتر ول بھی لگوا دیے۔حمیدہ کی برادری پہلے تو یہ سن کر پتھرا گئی۔ پھر جب یہ ابتدائی شاک گزر گیا تو پوری برادری حرکت میں آ گئی۔حمیدہ کے ماں باپ، سکھی ساتھیوں نے ہاتھ جوڑ دیے۔حمیدہ پر ایک چپ طاری تھی۔ وہ معافی مانگنے اور نا کردہ گناہوں سے توبہ کرنے پر تیار تھی مگر کلمہ پڑھنے سے انکاری۔

'سب کے سامنے پڑھ لے نیک بخت، دل کا حال یسوع مسیح جانتے ہیں' اس کے گرجا کے پادری تک نے سمجھایا۔ اس نے پادری سے اکیلے میں ملنے کی درخواست کی۔ اگر اس ملاقات سے کلمہ پڑھنے کی کوئی صورت نکل سکتی تھی تو تھانے دار ہر سہولت دینے کو تیار تھا۔حمیدہ اور پادری کی ملاقات کا انتظام ہو گیا۔

'فادر معاملہ اتنا نازک ہے کہ میں کل سے زیادہ اس کو ٹال نہیں سکتا۔ ملک کا پریس اس کی بو سونگھ چکا ہے۔ سیاستدان اپنی دکان چمکانے کے لیے کل سے بیان داغنے لگیں گے،بس آج کی رات ہے تمھارے پاس۔' تھانے دار نے پادری کو خبردار کیا۔

'پادری نے حمیدہ کے گلے میں ایک صلیب کے نشان کا ہار ڈال دیا۔اسے سمجھایا کہ اگر وہ جان بچانے کے لیے جھوٹ بول دے،کلمہ پڑھ لے تو یقیناً مسیح اسے معاف کریں گے۔ پر کسی اور شہر چلی جانا،لوگ بھول جاتے ہیں۔' سب کچھ سن کر حمیدہ نے صرف ایک سوال کیا۔

'ہولی فادر میری جگہ آپ ہوتے تو کیا کلمہ پڑھ لیتے؟'

'میری بات اور ہے حمیدہ، میری بات اور ہے، ابھی بات تیری ہو رہی ہے۔'

'میری بات بھی اور ہے فادر۔ میں کلمہ نہیں پڑھوں گی۔ یہ کلمہ نہیں ہوگا یہ عبدالحق کے

سامنے ہتھیار ڈالنا ہوگا۔'

حمیدہ کی بات پادری کی سمجھ میں نہیں آئی، حمیدہ کے ماں باپ کی ہچکی نہیں تھمتی تھی۔

'صدمے سے اس کا دماغ ماؤف ہو چکا ہے' فادر نے تھانے دار کو سمجھایا۔ 'دو چار روز اور مل جاتے تو شاید۔۔'

'معاملہ میرے اختیار سے باہر ہے فادر کل سے یہ اخبار اور ٹی وی والے اس مجمع کے لوگوں سے خود پوچھ گچھ کریں گے اور پھر مجھ پر یہ الزام آئے گا کہ مجرم کو پناہ دے رہا ہوں' تھانے دار نے رکھائی اور بے رخی سے کہا۔

صبح تک تھانے کے باہر مسیحی برادری کے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ کچھ بیٹھے تھے کچھ وہیں درختوں کے پاس پیٹھ لگا کر بیٹھ گئے تھے۔ تھانے دار نے مولوی عبدالحق کو بلا بھیجا۔ حمیدہ کے باپ نے اپنا صافہ عبدالحق کے پیروں میں ڈال دیا۔ عبدالحق صافے کو پھلانگ کر تھانے دار کے کمرے میں داخل ہو گئے۔

'حمیدہ کلمہ پڑھ لے تو کوئی صورت نکل آئے گی' انھوں نے دروازے سے پلٹ کر حمیدہ کے باپ کو تسلی دی یا چیلنج کیا۔

'مولوی صاحب اس بدبخت کا دماغ خراب ہو چکا ہے۔ اسے کچھ پتا نہیں اپنے انجام کا۔ معافی مانگنے کو تیار ہے مگر کلمہ پڑھنے سے انکاری ہے۔'

'دیکھا، دیکھا' عبدالحق برانگیختہ ہو گئے۔ 'ہم نے اسے سزا دلوانے میں پہلے ہی چوبیس گھنٹے کی تاخیر کر دی ہے، خدا ہمیں معاف کرے۔ اس جیسی مردود کو قرار واقعی سزا ملنی چاہیے۔'

عبدالحق کو مزید یہاں ٹھہرنا بے کار محسوس ہوا۔ وہ تھانے سے باہر نکلے تو اخباری نمائندوں کا ایک گروہ ان کا منتظر تھا۔

'یہ گستاخِ رسول ہے اور توہینِ رسالت کی سزا موت ہے۔ اس نے بہت سی شہادتوں کی موجودگی میں یہ ناپاک حرکت کی ہے اور ابھی یہ بیان دیا ہے کہ وہ اس پر نادم بھی نہیں۔ ہم اسلام کا نام اونچا رکھیں گے۔ یہ صیہونی سازش ہے، یہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو سویڈن سے شروع

ہوا تھا' عبدالحق کا جوش اخباری نمائندوں کے قلم کے ذریعے صفحہ قرطاس پر منتقل ہو رہا تھا۔

حمیدہ کا مقدمہ صرف ایک ہفتہ چلا۔ اتنے گواہوں کی موجودگی میں استغاثہ کا کیس واضح اور مضبوط تھا۔ وفاقی شرعی عدالت کی طرف سے اس کی سزائے موت کی اپیل بھی مسترد ہوگئی۔ جس دن حمیدہ کو سزائے موت ملی فیصل آباد میں مٹھائی تقسیم ہوئی اور عوام نے سکون کا سانس لیا کہ ایک نامرادِ رسالت اپنے انجام کو پہنچا۔

عبدالحق اب بھی بیٹھک میں اخبار پڑھتے ہیں مگر گود میں رکھ کر۔ اب گھر کی صفائی عائشہ اور سعیدہ کرتی ہیں کہ بستی کے خاکروب گھرانے ان کے گھر کام کرنے سے انکاری ہیں۔ فی الحال عبدالحق اپنی گند خود اٹھا رہے ہیں۔ آج بھی اخبار پڑھ کر تکیے کے نیچے رکھا اور جمیل صاحب کے بچوں کو قرآن پڑھانے ان کے گھر پہنچ گئے۔ دالان میں بیٹھ کر جمیل صاحب سے باتیں کر رہے تھے کہ ایک ادھیڑ عمر کی کام کرنے والی عورت جھاڑو اور پوچا لے کر نمودار ہوئی۔

'جمیل صاحب اپنی ماسی سے کہو کلمہ پڑھ لے، ورنہ دوزخ کی آگ میں جلائی جائے گی۔'

اس سے پہلے کہ جمیل صاحب جواب دیتے ماسی کے ہاتھ سے جھاڑو گر پڑی۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوگئی اور کانپتی آواز میں بولی

'پڑھوں گی، پڑھوں گی، جو کلمہ بولو پڑھوں گی اور نبی جی کی عزت بھی کروں گی، بس مجھے زندہ رہنے دینا۔'

مسابقت

نیو یارک شہر کے دو بڑے بین الاقوامی ایر پورٹ ہیں، لا گارڈیا اور جان ایف کینیڈی ایر پورٹ۔ ان میں سے جان ایف کینیڈی کے نو ٹرمینل ہیں۔ انسانیت کا ایک سیلاب ہے جو ہر روز اس ایر پورٹ سے گزرتا ہے۔ایک محتاط اندازے کے مطابق روزانہ ایک لاکھ سے زیادہ مسافر اپنے رختِ سفر کی طنابیں کھینچتے ہیں۔ اذنِ سفر ہو یا اختتامِ سفر اور بہت سے مسافروں کے لیے محض ایک مسافر خانہ ہے، ذرا ستا کے پھر منزل کی طرف گامزن۔ ذرا دیر ایک کونے میں بیٹھ کر دیکھیے، ہر چہرہ اپنی ایک مکمل داستان ہے۔ کچھ چہروں پر پا لینے کی خوشی ہویدا ہے تو کچھ انجانی راہوں اور امتحانوں کے خوف سے کشیدہ۔ چند چہرے آنسوؤں سے تر ہیں کہ اپنوں سے بچھڑنے کا غم ہے اور کچھ پر ایک انجانی مسرت بکھری ہے کہ نئی دنیاؤں کے اسرار سے پردہ اٹھانے کا وقت آ رہا ہے۔

انسانوں کے اس سیلِ رواں میں عاطف اور حمیرا پی آئی اے کی پرواز سے ٹرمینل چار پر اترے۔ خوشی دونوں کے چہروں سے عیاں تھی۔ اس جوڑے کو رشتۂ ازدواج میں جڑے ابھی ایک ہی ماہ ہوا تھا۔میڈیکل کالج کے آخری سال میں کچھ ایسی دوستی ہوئی جو بہت جلد چاہت میں بدل گئی۔ ہاؤس جاب سے پہلے ہی دونوں رشتۂ ازدواج میں بندھ چکے تھے۔ امریکہ میں

ٹریننگ، مالی ترقی اور گرین کارڈ دونوں ہی کا خواب تھا۔ اور اب یہ خواب ایک تابناک مستقبل کی پہلی سیڑھی کی شکل میں سامنے تھا۔

'مجھے فارم دو، میں بھر دوں' عاطف نے حمیرا سے اس کا پاسپورٹ لے کر اس کا اور اپنا امیگریشن فارم بھر دیا۔ گو حمیرا نے فارم بھرنا شروع کر دیا تھا، پھر بھی عاطف نے فارم اس کے ہاتھ سے لے کر خود بھر دیا۔ سماجی ترقی اور معاشرتی ہم آہنگی کا ایک دلچسپ میزان غالباً یہ ہو سکتا ہے کہ سڑک پر آپ جائزہ لیں کہ کتنی گاڑیوں میں خواتین ڈرائیور ہیں جب کہ مرد برابر میں مسافر بنا بیٹھا ہو۔ یا ایر پورٹ پر شمار کیا جائے کہ کتنے مرد اپنی عورتوں سے فارم لے کر خود بھر رہے ہوں۔ عاطف نے فارم بھر کے تیز تیز سامان جمع کرنا شروع کر دیا۔ دونوں امریکہ میں داخل ہونے والے تھے۔ بظاہر جدید معاشرتی طرز جمہور کا علمبردار امریکہ، ترقی خوش حالی اور بہتر مستقبل کا ضامن امریکہ۔ بہتر مستقبل کی تعریف کا انحصار لغت پر ہے۔ لیکن یہاں پہلے امیگریشن کا مرحلہ درکار تھا۔ امیگریشن کی بائیس کھڑکیاں تھیں ۔ ہر کھڑکی کے سامنے پُر امید چہروں کی ایک طویل قطار۔ عاطف اور حمیرا کو یہ انتظار قطعاً برا نہیں لگا۔ بلکہ دل میں ایک فخر کا سا احساس تھا کہ ہم اس قطار میں کھڑے ہیں جو سیدھی ارم کے دروازے کی طرف نکلتی ہے۔ دونوں نے مسکرا کے ایک دوسرے کی طرف طمانیت بھری نظر ڈالی۔ جیسے آپ کسی سگنل پر گاڑی کو روکیں اور آپ کے برابر میں آ کر جو گاڑی کھڑی ہو اس کا بھی وہی رنگ و ماڈل ہو جو آپ کی کار کا ہو۔ دونوں گاڑیوں کے مالکان ایک دوسرے کی جانب ایک فخر اور طمانیت بھری نظر ڈالتے ہیں ۔ واہ آپ کا ذوق بھی میری طرح اعلیٰ ہے، یا آپ بھی میری طرح خوش نصیب ہیں۔

'آپ کا نام؟' امیگریشن افسر کی آواز نے دونوں کو اپنی اپنی خیالی دنیاؤں میں جگا دیا۔

'میرا نام عاطف حسین اور ان کا حمیرا حسین' عاطف نے دونوں کی طرف سے جواب دے دیا۔

'آپ کوئی ممنوعہ شے لے کر آ رہی ہیں' امیگریشن افسر نے پھر حمیرا سے براہ راست سوال کیا۔

'نہیں' اس سے پہلے کہ حمیرا جواب دیتی، عاطف بول پڑا۔
'انھیں انگریزی آتی ہے؟' امیگریشن افسر نے طنزیہ سرزنش کی۔
'جی، جی' عاطف کچھ خفیف سا ہوا اور بیوی کو ٹھوکا دیا۔ جیسے کہہ رہا ہو کچھ بولو بھی، کہیں تمھارے چکر میں ویزا منع نہ ہو جائے۔

ایرپورٹ سے باہر نکلے تو دونوں بھونچکے رہ گئے۔ باہر جانے کے دروازے کے سامنے وہی کراچی ایرپورٹ کا منظر تھا۔ ساڑھیاں، شلوار قمیض اور رنگ برنگے ڈوپٹے۔ سینکڑوں پاکستانی اپنے رشتہ داروں کو لینے ایرپورٹ پہنچے ہوئے تھے۔ پی آئی اے کی پرواز کے وقت نیو یارک ایرپورٹ کا ٹرمینل چار، کراچی ایرپورٹ میں بدل جاتا ہے۔ ہر عمر کے بچے، گود میں ہمکتے سے لے کر لڑکپن کو خیر آباد کہنے والی عمر تک کے بچے۔ بروکیڈ کے جمپر، چیختی رنگوں کی قمیضیں اور ان پر کہیں کہیں بے جوڑ شلواریں۔ چوڑیوں سے بھرے ہاتھ۔ جن جوڑوں کے ساتھ بچے ہیں وہ اکثر ماؤں کی گودوں میں لدے ہوئے۔ مرد حضرات سگریٹ بجھانے کے ڈرم کے پاس جمع ہیں۔ حمیرا کے آگے جنوبی ہند کا ایک نوجوان مسافر تھا۔ اسے دیکھتے ہی ایک لڑکی آگے بڑھی اور جھک کر اپنے پتی کے قدم چھو لیے۔ مرد نے چور نظروں سے آس پاس دیکھا لیکن کوئی متوجہ نہیں تھا۔ اس نے اشارے سے لڑکی کو کھڑے ہونے کی اجازت دی۔ حمیرا ابھی اس پوجا کو سمجھ بھی نہیں سکی تھی کہ زبیر کو آگے بڑھتے دیکھ کر اس کی توجہ بٹ گئی۔ زبیر، عاطف کا بچپن کا دوست تھا۔ امریکہ میں تین سال سے مقیم۔ اسی نے زور دے کر اور اپنی کامیابیوں کے قصے سنا سنا کر عاطف اور حمیرا کی رہی سہی ہچکچاہٹ دور کر دی تھی۔ زبیر کی لمبی، چمکیلی، کالی گاڑی لانگ آئلینڈ کی ہائی وے پر فراٹے بھرنے لگی۔ سڑک کے دونوں طرف سبزے کی بھرمار تھی، گویا در و دیوار سے ابل رہا ہو۔ دو رویہ اونچے چنار اور صنوبر کے درخت۔ اتنے قریب قریب اور گھنے کہ درمیان میں روشنی کا گزر بھی مشکل ہو جائے۔ جب گاڑی زبیر کے گھر کے سامنے رکی عاطف اور حنا متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے۔ ایک خوبصورت بنگلہ، سامنے گاڑی کے پورچ کے ساتھ ساتھ خوشنما رنگوں کے پھول بہار دکھلا رہے تھے۔ سبز گھاس کے پتے اس طرح ایک ہی قد کے تھے

جیسے مالی نے ناپ کر لگائے ہوں۔

'ایک دو سال میں انشاء اللہ میرا گھر بھی ایسا ہی ہوگا'۔ عاطف نے دل میں سوچا۔

دو چار دن زبیر کے ساتھ رہ کر دونوں میاں بیوی ایک چھوٹے اپارٹمنٹ میں منتقل ہوگئے۔ اب دونوں نے جز وقتی نوکری کر لی اور امتحان کی تیاری میں جت گئے کہ نیو یارک میں لائسنس مل جائے تو اپنی ڈاکٹری کے جوہر دکھا سکیں۔ امریکہ آنے والے ہر ڈاکٹر کو امریکی حکومت کا ایک امتحان پاس کرنا پڑتا ہے تاکہ بیرونی ملکوں سے آنے والے ڈاکٹروں کی ایک ہی معیار پر جانچ ہو سکے۔ امتحان خاصا سخت ہوتا ہے۔ حمیرا اور عاطف دونوں نے جان توڑ محنت کی۔ بچوں کے جھمیلوں سے فی الحال دونوں آزاد تھے۔ نیو یارک میں ابھی ایسا میل ملاپ بھی نہیں ہوا تھا۔ بس لے دے کر زبیر سے ملتے یا اس کے توسط سے دو تین پاکستانی گھرانوں سے یاد اللہ ہوگئی تھی۔ تقریباً تین ماہ کی تیاری کے بعد دونوں امتحان میں بیٹھے۔ شومئی قسمت حمیرا تو پاس ہوگئی لیکن عاطف کا نتیجہ خاطر خواہ نہ آیا۔ جب نتیجہ آیا حمیرا اس وقت نوکری پر تھی۔ ڈاکٹری امتحان کا یہ نتیجہ یو ایس نیوز کے درمیانی صفحوں میں شائع ہوتا ہے۔ حمیرا بے چینی سے انتظار کرتی رہی لیکن عاطف کا فون نہ آیا۔ عاطف گھر پر تھا اور نتیجہ اسے ہی دیکھنا تھا۔ آخر حمیرا سے رہا نہ گیا اور اس نے اسٹر کے مالک سے اجازت لے کر گھر فون کیا۔

'عاطف کیا ہوا، رزلٹ آیا؟ تم نے فون ہی نہیں کیا'۔

'ہاں مبارک ہو تم پاس ہوگئیں' عاطف کی آواز میں خوشی یا گرم جوشی کا فقدان تھا۔

'اور تم؟' حمیرا کا ذہن ابھی تک اس پیچیدگی کو نہیں سمجھ سکا تھا۔

'مجھے پہلے ہی پتہ تھا۔ وقت کی کمی کی وجہ سے میرے پانچ سوال چھوٹ گئے تھے۔ میرا نام نہیں ہے اخبار میں' عاطف بہت اداس لہجے میں بولا۔

'اوہ' حمیرا کی سمجھ میں نہیں آیا اور کیا کہے۔ اب اس کا گھر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ عاطف کا سامنا کیسے کرے گی۔ اسے اپنی خوشی بھی پھیکی محسوس ہوئی، ممتحنوں پر بہت غصہ آیا۔

گھر پہنچی تو زبیر کی گاڑی بھی اسی وقت ان کے اپارٹمنٹ کے سامنے رکی۔ حمیرا دانستہ

کچھ آہستہ قدم ہوگئی کہ زبیر کی موجودگی میں عاطف سے سامنا آسان ہوجائے گا۔ وہ جو زبیر کی وقت بے وقت آمد سے تنگ ہونے لگی تھی، اس وقت زبیر کو دیکھ کر دل میں سکون کا سانس لیا، زبیر کے استفسار پر اس نے رزلٹ کی تفصیل بتا دی۔

'او مبارکاں، مٹھائیاں بھئی مٹھائیاں' زبیر نے عاطف کو مبارک باد دی۔' اوئے تیری شکل کیوں اتری ہوئی ہے' زبیر نے عاطف کو ڈانٹا۔' بھابی تیرے سے زیادہ قابل نکلی ہے اس لیے؟' عاطف کے چہرے کا رنگ بدل سا گیا۔ زبیر اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا۔

'چلو تم لوگوں کی مشکل آسان ہوئی۔ ایک کام کرے، دوسرا لگ کر پڑھائی کرے پھر امتحان دے۔'

زبیر کے جانے کے بعد عاطف نے حمیرا کو مبارک باد دی۔ حمیرا کو واقعی بہت افسوس تھا کہ عاطف کا امتحان نہیں نکل سکا۔ وہ رو پڑی۔

'مجھے بالکل خوشی نہیں ہو رہی۔ اس سے تو اچھا تھا میں فیل ہو جاتی اور آپ پاس ہوجاتے۔'

عاطف نے حمیرا کی بات کی تردید ضروری نہ جانی۔

'تم اب فوراً نوکری شروع کردو۔ میرے انتظار میں نہ بیٹھ جانا۔' عاطف نے یوں سمجھایا جیسے کسی اَن ہونی کی اجازت دے رہا ہو۔

حمیرا کو قریبی ہسپتال میں ہی نوکری مل گئی۔ عاطف نے اپنی نوکری چھوڑ دی اور سارا دھیان پڑھائی پر لگا دیا، حمیرا کو محسوس ہو رہا تھا کہ نتیجے کے بعد سے عاطف کے حوصلے میں وہ بات نہیں رہ گئی۔ حمیرا کی شعوری کوشش ہوتی کہ مریضوں اور ہسپتال کے بارے میں زیادہ گھر میں گفتگو نہ کرے۔ گو اس کا دل بہت چاہتا کہ عاطف سے امریکہ اور پاکستان کے ہسپتالوں، طریقۂ علاج، ادویات ہر چیز کے بارے میں خوب گفتگو کرے۔ مگر عاطف نے کبھی زیادہ دلچسپی ظاہر نہیں کی اور حمیرا ابھی تک چور بنی ہوئی تھی۔ حمیرا کی نوکری بہت سخت تھی لیکن اس نے عاطف کی پڑھائی اور ضروریات کا پورا خیال رکھا۔ جب بھی گھر پر ہوتی، عاطف کو اٹھنے نہ

دیتی۔ چائے بنا کر دینا، ہر کام خود بھاگ بھاگ کے کرتا۔ چھٹی کے دن کھانا بنا کر فرج میں رکھ دیتی کہ عاطف گرم کر کے کھا لے اور اس کی نوکری کی وجہ سے عاطف کی پڑھائی کا حرج نہ ہو۔

اسی تگ و دو میں تین ماہ پھر گزر گئے اور عاطف کے امتحان کا وقت آ گیا۔ عاطف نے بھی بہت محنت کی تھی۔ گھڑی سامنے رکھ کر اکثر سوالات کی مشق کرتا کہ امتحان وقت پر ختم ہوجائے اور کوئی سوال رہنے نہ پائے۔ پر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ عاطف اس دفعہ بھی امتحان میں فیل ہوگیا۔ اب گھر کی فضا میں ایک تناؤ سا رہنے لگا۔ ادھر حمیرا کی ہسپتال میں مصروفیات بڑھتی جا رہی تھیں۔

'واقعی گھر داماد رہنا کیسا ہوتا ہوگا' عاطف نے کئی بار سوچا۔ حمیرا سے پیسے مانگتے اسے بہت جھجک ہوتی۔ جب میں کما رہا تھا تو حمیرا تو بہت آسانی سے مجھ سے پیسے مانگ لیتی تھی بلکہ لڑ جھگڑ کر اور ہتھیا لیتی تھی، اس نے کئی بار اپنے آپ کو یاد دلایا۔ ویسے حمیرا خود کوشش کرتی کہ ایسی نوبت نہ آئے، اس نے دونوں کا مشترکہ اکاؤنٹ رکھا تھا۔ عاطف کوئی بڑی چیز خریدنا چاہتا یا ضرورت ناگزیر ہو جاتی تو گھنٹوں ہمت جمع کرتا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد یہ پل بھی عبور ہوجاتا۔ حمیرا پڑھی لکھی لڑکی تھی، شوہر کی اندرونی جنگ سے آشنا۔ لیکن کبھی عاطف پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ عاطف نے ایک بار پھر نوکری کر لی۔ اس دفعہ ایک اسٹور میں چوکیدار کی نوکری ملی۔ پہلے تو حمیرا نے مقدور بھر مخالفت کی کہ نوکری کی ضرورت کیا ہے، پھر عاطف کی خودداری کا سوچ کر اس نے مخالفت ترک کر دی۔ اس نے بہت زور دیا کہ چوکیدار کی بجائے اپنے ہسپتال میں ٹیکنیشین کی نوکری دلوا دے، پیسے بھی بہت اچھے تھے اور زیادہ وقت بھی ہسپتال میں گزرتا۔ مگر عاطف نے اس شد و مد سے انکار کیا کہ وہ ڈر سی گئی۔

تیسری مرتبہ فیل ہونے کے بعد تو گھر کا ماحول ایسا ہوگیا جیسے گھر میں کسی کا انتقال ہو گیا ہو۔ اس دن عاطف گھر نہیں آیا۔ رزلٹ دیکھنے کے بعد میلوں پیدل چلتا رہا۔ حمیرا کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اپنے ذہن کے کسی گوشے میں وہ اب ان سب کا ذمہ دار حمیرا کو ٹھہرا چکا تھا۔ امریکہ میں ڈاکٹری کرنے کے بعد حمیرا کی شخصیت میں ایک عجیب نکھار اور اعتماد آ گیا تھا۔ جب کہ عاطف کو لگتا دیواریں اس پر بند ہو رہی ہیں۔ دماغ بالکل خالی تھا، کسی بھی

اچھے یا برے خیال سے مبرّا۔ وہ چلتا رہا۔ قدم خود بہ خود میکانکی انداز میں اٹھ رہے تھے۔ پیدل چلتے چلتے زبیر کے گھر جا پہنچا۔ وہی سبزہ زار جو اسے پہلی نظر میں مانند بہشت لگا تھا اب بالکل پھیکا اور بے رونق لگا۔ زبیر اسی گرم جوشی سے ملا۔ مگر عاطف کو اس کا انداز معاندانہ اور رسمی سا لگا۔ زبیر نے تپاک سے بٹھایا، رزلٹ کا ذکر تک نہیں کیا۔

عاطف صوفے پر نیم دراز سا ہو گیا، داہنا ہاتھ سر کے پیچھے، بایاں پتلون کی جیب میں۔

'میں واپس جا رہا ہوں' یہ جملہ وہ نہ جانے کب سے کس سے کہنا چاہ رہا تھا۔

'پاگل ہوئے ہو؟' زبیر نے فہمائش کی۔ کتنا پیسہ لگا کر یہاں آئے تھے۔ یاد ہے ؎

شہر میں آکر پڑھنے والے بھول گئے

کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا

زبیر نے ماحول کی سنجیدگی کو کم کرنے کی کوشش کی۔

'میں نے بہت سوچا ہے، بس میں واپس جا رہا ہوں' عاطف اڑا رہا۔

'کوئی اور کام کر لو، پھر حمیرا کا اتنا شاندار کلینک چل رہا ہے۔ اس سے بات کی ہے تم نے؟'

'نہیں مجھے پتہ ہے وہ کیا کہے گی' عاطف سب سوال و جواب اپنے آپ سے پہلے ہی کر چکا تھا۔

'واقعی، تمھیں پتہ ہے وہ کیا کہے گی' زبیر نے طنز کیا۔ 'عاطف اب تم پاکستان میں بھی اتنا نہیں کما سکتے جتنا یہاں کما سکتے ہو۔ کاروں کا شوروم کھول لو۔ فارمیسی کھول لو، کچھ اور کام کر لو، بھاڑ میں گئی یہ ڈاکٹری' زبیر نے سنجیدگی سے اپنے دوست کو مشورہ دیا۔

'مجھے پتہ ہے یار، لیکن بات پیسے کی نہیں ہے۔ پیسے تو حمیرا کافی کما رہی ہے جو ہم دونوں کے لیے کافی ہیں' عاطف کی مستقل مزاجی زبیر کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

'پھر کیا مسئلہ ہے؟'

'تم نہیں سمجھو گے' عاطف نے ٹالنے کی کوشش کی۔

'تم سمجھانے کی کوشش تو کرو۔ اور نہیں تو حمیرا کے کیریئر کی سوچو۔ وہ اتنی کامیاب جا رہی ہے۔ وہاں جا کر اس کا کیریئر صفر سے شروع ہوگا' زبیر نے ہمت نہ ہاری۔

'میں نے کہا نہ کہ تم نہیں سمجھ سکتے۔ ہو سکے تو اپنے دوست ٹریول ایجنٹ سے میرا ٹکٹ بنوا دو۔ حمیرا یہاں رہ کر کیریئر بنا سکتی ہے۔' عاطف نے گویا دھماکہ کیا۔

'تم آدمی ہو یا پیجامہ، اس نوکری کے لیے بیوی کو چھوڑ کر جا رہے ہو' زبیر کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے کیا سنا ہے۔

'میں نے یہ کب کہا ہے۔ وہ ساتھ آنا چاہے تو ضرور آئے، اس صورت میں دو ٹکٹ بنوا دینا۔' عاطف کی ہنسی ہذیانی سی تھی۔

'میرے ٹکٹ بنوانے کی ضرورت نہیں ہے، حمیرا یہ دو یک طرفہ ٹکٹ نیو یارک سے کراچی کے پہلے ہی بنوا چکی ہے۔ صبح جب اخبار میں رزلٹ آیا، اس کے بعد حمیرا کا فون آیا تھا اور تمھیں یہ اعتماد ہے کہ تمھیں معلوم ہے وہ کیا جواب دے گی۔' زبیر اپنے لہجے سے حقارت نہ چھپا سکا اور اپنے دوست کو خود شناسائی کے گرداب میں چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

نگینہ

بات سنبھلی رہتی اگر اماں کو یہ وہم نہ ہو جاتا کہ بس اب کسی بھی روز ان کا بلاوہ آجائے گا۔ بھلا بتلایئے آج کل ساٹھ برس کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔ وہ بھی امریکہ میں کہ جہاں خواتین کی اوسط عمر اسی جمع چند سال ہے۔ ساٹھ سال کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی ایک تہائی زندگی باقی ہے۔ مگر جیسے بڑھاپے کا عشق سزا بن جاتا ہے اسی طرح بڑھاپے کا حج ان دیکھی مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔ اماں جب سے حج کر کے آئیں تھیں بیت اللہ سے یہ یقین لے کر لوٹی تھیں کہ 'بیٹا اب میری زندگی مکمل ہوگئی ہے۔' پھر اس کے بعد ٹیپ کا مصرع یہ کہ 'کسی وقت بھی بلاوا آسکتا ہے۔' میں جو اب تک معاملہ ٹال رہا تھا اب اماں کے جال میں مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ ہفتے میں دو تین بار ہماری گفتگو نہ جانے کیسے اس رخ پر مڑ جاتی۔

'پھر بیٹا تم نے کیا فیصلہ کیا؟'

'کس بات کا اماں؟' سوال کا جواب سوال سے دیجیے آزمودہ نسخہ ہے، اکثر سوال کرنے والا جل کر معاملہ وہیں چھوڑ دیتا ہے۔

'ایسے انجان مت بنو۔ تمھیں اچھی طرح معلوم ہے۔ بیٹا میری زندگی کا کیا بھروسہ، آج ہوں کل نہیں۔' یہاں واسطہ ایسے غنیم سے تھا جو میرے سارے ہتھیاروں سے مانوس تھا۔

'کہیں جا رہی ہیں آپ۔'

'دیکھو فیضان مجھ سے یہ کھیل نہیں کھیلو۔ ہاں بیٹا اپنے خالق کے پاس جانے والی ہوں، سب کو جانا ہے۔ مگر چاہتی ہوں جانے سے پہلے تیرا کوئی ٹھکانا ہو جائے۔'

'مگر امی میرا یہ ٹھکانا ہے تو' میں نے احتجاج کیا۔

'فیضان اب یہ مسخرہ پن پرانا ہو چکا۔ میں چاہتی ہوں تم اس ربیع الاول میں شادی کر لو۔ بیٹا عورت گھر میں ہو تو برکت ہوتی ہے۔ یہاں کے آسمانوں پر تو ویسے بھی رحمت کے فرشتے دورانِ پرواز ہی رخ بدل لیتے ہیں۔ کچھ پتا نہیں بیوی کے روپ میں عورت ملے گی یا مرد۔ بہتر ہے کہ گھر میں بیوی ہو، گھر مکان بن جاتا ہے۔ آدمی کا اعتبار ہو جاتا ہے۔'

'انسان کے سوا کسی بھی دوسری مخلوق کی مونث اپنی تعریف اتنے کھلے الفاظ میں کرنے سے یقیناً شرمائے گی!'

'فیضان پلیز بیٹا مذاق نہیں۔ اب یہ بات ربیع الاول سے آگے نہیں بڑھے گی۔ میرا فیصلہ حتمی ہے۔ تو نہیں چاہتا کہ میری زندگی میں یہ کام ہو جائے؟' دوسرے ہتھیار کند ہوئے تو اماں نے آنسوؤں کے گولے نکال لیے۔

'اماں پلیز، شادی کی ضرورت کیا ہے' میری پسپائی شروع ہو گئی۔

'شادی کی ضرورت کیا ہے؟ بیٹا دماغ ٹھیک ہے تمھارا۔ کہنا کیا چاہ رہے ہو؟ اماں کے اس سوال میں اتنے غیر ممکن قسم کے شکوک بھرے تھے کہ مجھے فوراً پسپا ہونا پڑا۔

'اماں، میرا مطلب ہے شادی کر کے انسان گویا اپنی شخصیت کی وضاحت کر دیتا ہے، یا یہ کہ شاید اپنے آپ کو Define کر دیتا ہے' میں کچھ الجھ سا گیا۔ کیسے سمجھاؤں اماں کو یہ بات۔

'بیٹا فیضان فلسفہ نہیں۔ میں نے بھی یہاں امریکہ کے ہائی اسکول میں پڑھایا ہے۔ جب میں ان ٹین ایجرز سے نمٹ سکتی ہوں تو تم مجھے کیا جھانسہ دو گے۔ فلسفہ نہیں چاہیے مجھے ربیع الاول میں شادی کی تاریخ چاہیے۔ جیتے جی بس یہ آخری ارمان نکال لوں پھر زندگی پوری۔' اماں نے ٹین ایجرز سے اور کچھ سیکھا ہو یا نہ سیکھا ہو، بندے کو چلانا اور اپنی بات منوانا ضرور سیکھ لیا تھا۔

اس قسم کی گفتگو اب روز کا معمول تھی۔ ماحول لاابالی سے مزاح پھر گستاخی کی منازل

طے کرتا اب واضح طور پر تناؤ کا شکار تھا۔ میرا مسئلہ یہ تھا کہ میرے پاس قابلِ فروخت دلائل کی کمی تھی۔ ڈاکٹری کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی، دو سال سے ڈھیر سارے پیسے کما رہا تھا۔ نیویارک میں تقریباً سب ہی دوست، ساتھ کے سب ہی ڈاکٹر شادی کر چکے تھے۔ میری کسل مندی کی وجہ صرف اپنی آزادی سے پیار تھا۔ پھر شاید ذہن کے کسی دریچے میں یہ بھی وہم کہ اماں سے میرے تعلقات کے بیچ کوئی اور نہ آجائے۔ بیوگی کے بعد سے اماں نے ساری زندگی میرے لیے وقف کر دی تھی۔ اماں کی امیدوں، اماں کے مستقبل کی منصوبہ بندی، ان کی سوچ سب کا فوکس میں ہی تھا۔ یہ کس قسم کی ممتا تھی جواب یہ محبت بانٹنے پر نہ صرف آمادہ تھی بلکہ تڑپ رہی تھی۔ اس معرکہ میں ساجدہ بھابی کا کراچی سے فون تابوتِ شکست میں آخری کیل تھا۔

'خالہ میں نے فیضان کے لیے ایک لڑکی دیکھی ہے، آپ فیضان سے کہیں یہاں آکر، مل کر پسند کر جائے۔'

ساجدہ میرے خالہ زاد بھائی کی بیوی تھی۔ میری بہت مزاج شناس، بہت اچھی دوست۔

'جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے' میں نے ساجدہ کو دہائی دی۔

' بکومت فیضان۔ بات یہ ہے کہ یہ لڑکی اتنی مکمل ہے کہ مل کر مجھے یقین نہیں آیا۔ اگر کبھی صفدر نے سوکن لانے کی کوشش کی تو غالباً صرف اس لڑکی کو اجازت ہو گی۔' ساجدہ کی مثالیں اپنی مثال آپ تھیں۔

'ساجدہ میری آزادی تمھیں کیوں کھل رہی ہے؟'

'دیکھو فیضان شادی تو تمھیں کرنی ہی ہے۔ اب تم خالہ کا زیادہ دن مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لڑکی کی اتنی جلدی شادی ہوگی کہ ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہے۔ گھر میں اپنے ایک دور کے رشتہ دار کی بیٹی کے ساتھ رہتی ہے اور کوئی بھائی بہن نہیں۔

'ارے بھئی کوئی نام بھی ہے اس حور کا۔'

'تمھیں کیسے پتہ چلا۔'

'کیا کیسے پتہ چلا؟'

'کہ اس کا نام حور ہے۔'

سچ پوچھیے تو مجھے ذرا کوفت سی ہوئی۔ یہ بات ایسی ہی لگی جیسے کسی کمزور شعر کو ترنم کا سہارا دینے کی کوشش کرے۔ خیر، جائے ماندن نہ پائے رفتن ایک ہفتے میں میرا سامان گاڑی کے ٹرنک میں تھا۔ اماں خود چھوڑنے جان ایف کینیڈی ایر پورٹ آئیں۔

'فیضان اچھی طرح دیکھ سمجھ لینا بیٹا۔ تمھیں ساری زندگی گزارنی ہے۔ پسند نہ آئے تو جلدی مت کرنا۔'

میں اماں کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

کراچی ایر پورٹ پر ساجدہ بھابی اور صفدر موجود تھے۔ اتنے دنوں کے بعد ملے تھے مزا آ گیا۔

'وہ حور کہاں ہے بھابی، شاید شرما کے چھپ رہی ہے' میں نے ایر پورٹ پر ساجدہ کو چھیڑا۔

' بکو مت، اسے تمھارے متعلق اور تمھارے ارادوں کی بابت کچھ پتہ نہیں ہے۔ میری اچھی دوست ہے، اسے صرف یہ پتہ ہے کہ تم ہم لوگوں سے ملنے اور ایک ہفتہ دس دن چھٹی گزارنے یہاں آئے ہو۔ مجھے یہ بات سخت ناپسند ہے کہ لڑکیوں کو قطار بنا کر سوئمبر رچایا جائے۔ دیکھو لڑکی یہ شہزادہ تمھیں نظر آ رہا ہے اور پھر وہ شہزادہ یہ کہہ کر آگے بڑھ جائے کہ تم میرے قابل نہیں ہو۔'

حقوقِ نسواں زندہ باد' صفدر نے ساجدہ کو چھیڑنے کے لیے نعرہ لگایا۔

'نہیں یار ساجدہ صحیح کہہ رہی ہے۔ بہت اچھا کیا کہ اسے نہیں بتایا ورنہ میں بہت پریشر میں آ جاتا اور وہ بھی کتنی کونشس ہو جاتی۔ بہتر یہی ہے کہ میں اس سے بغیر کسی امید اور آس کے ملوں۔'

'ابھی چلیں' ساجدہ بھابی نے چھیڑا۔

دوسرے دن مجھے ملانے کے بہانے ساجدہ بھابی حور کے گھر لے گئی۔ والد فوج میں کرنل تھے، اماں گو ڈاکٹری کی ڈگری رکھتی تھیں مگر گرہستن بنی رہیں۔ ملک بلا وجہ ایک ڈاکٹرنی سے محروم ہو گیا۔ ترقی پذیر ممالک کا ایک المیہ۔ حور کمرے میں کیا داخل ہوئی، کمرے میں وقار آ گیا۔ ساجدہ نے درست کہا تھا، وہ ایک مکمل لڑکی تھی۔ لمبا، اکہرا جسم، خوبصورت، پرکشش، گندمی رنگ، غزالی آنکھیں، گھنیرے بال، کیا چیز تھی جو متناسب نہیں تھی مگر یہ سب باتیں اس رکھاؤ کو بیان نہیں کر پا رہی ہیں جو اس لڑکی کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ چلتی تھی تو اس میں ایک شاہانہ وقار تھا۔ نشست،

برخاست، گفتگو، رہن سہن میں ایک شائستگی، قدموں میں بلا کا اعتماد۔ میں مسحور اسے دیکھتا رہ گیا۔ ساجدہ کے ہونٹوں پر جو پرسکون مسکان پھیل گئی تھی اس سے بے خبر۔

'بیٹھیے کیسے ہیں آپ' اس نے بہت وقار اور تمانت سے مجھے بٹھایا۔ چہرے پر کوئی گھبراہٹ نہیں۔ یا اللہ کیا کوئی مغل شہزادی روپ بدل کر اتر آئی ہے۔ یقین مانیے اس سے زیادہ کامل لڑکی کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس کی موجودگی سے کمرے میں ایک پاکیزگی کا احساس تھا۔ لگتا تھا اس کے اطراف میں نور کا ایک ہالہ اس کے ساتھ چل رہا ہے۔

میں تھوڑی دیر کا سوچ کر آیا تھا، بہت دیر بیٹھا۔ اس کی گفتگو میں متانت اور سنجیدگی تھی۔ وہ اس استانی کی مانند تھی جس کے سامنے بچے شرارت کرتے ہوئے خود ہی ڈر جاتے ہیں، بلاوجہ۔

اس دن اور اس کے بعد دوسرے دن وہ مجھے شہر دکھانے گھر سے باہر لے گئی۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر وہ کراچی میں تنہا نکل جائے تو منچلے اسے چھیڑنے سے گھبرائیں گے کہ کہیں گناہ نہ ملے، ایسا ملکوتی رکھ رکھاؤ تھا اس میں۔ تیسرے دن تک ہم ذاتی پسند و ناپسند کے سوالات داغنے لگے۔ وقتاً فوقتاً کوئی ملازم ڈرائنگ روم میں آکر چائے کے برتن لے جاتا، یا کھانا لگنے کی اطلاع کرتا۔ اس کے انداز میں ایک قدرتی تحکم تھا۔ اس کا فطری حق تھا کہ ملازمین اس سے شہزادیوں جیسا برتاؤ کریں۔ میرا خیال ہے کہ اسے میرے احساسات کا علم تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں مرعوب ہوں مگر شاید ابھی تک مقید نہیں۔ لیکن اس کے اعتماد سے ظاہر تھا کہ یہ صرف کچھ ہی دیر کی بات ہے کہ مرعوب، محصور ہو جائے۔

حور کا گھر خاصا آرام دہ تھا۔ چھاؤنی کے گھر اکثر کھلے برآمدوں اور دالانوں والے گھر ہوتے ہیں۔ حور کے والدین بھی مجھ سے خاصے تپاک سے ملے۔ ساجدہ کے والد اور حور کے والد بہت پرانے دوست تھے۔ مجھے شبہ ہے کہ ساجدہ میرے بارے میں حور کے والدین سے ضرور کچھ ساز باز کر رہی تھی۔ ابھی تک میں نہیں ملا تھا تو فرح سے۔ فرح والدین کے سائے سے بچپن ہی میں محروم ہو گئی تھی۔ لیکن حور کے والدین نے اس کی پرورش اور تعلیم میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ وہ اپنے کالج کے ساتھ شمالی علاقوں کی سیر پر گئی تھی اور کل تک واپسی متوقع تھی۔

میں حور اور اس کی والدہ کے ساتھ چائے پر گپیں لگا رہا تھا کہ فرح کمرے میں داخل

ہوئی۔ معمولی شکل وصورت کی شوخ سی لڑکی۔ آنکھوں میں ذہانت اور شرارت ناچ رہی تھی۔حور کی متانت کے مقابلے میں فرح کی شخصیت میں لا ابالی پن نمایاں تھا۔ لباس بھی ایسا ہی اوٹ پٹانگ۔ پہلا تاثر کچھ خاص نہیں تھا۔ فرح کے آجانے سے حور کی شخصیت اور متاثر کن ہوگئی تھی کہ اب فرق صاف واضح تھا۔ چائے پی چکے تو فرح برتن اٹھا کر باورچی خانے میں رکھ آئی۔ گو وہ برتن حور کی برابر والی تپائی پر حور کے زیادہ نزدیک رکھے تھے۔ اس شام پروگرام بنا کہ کلفٹن پر ساحل سمندر کے کنارے واقع ایک ریسٹورانٹ میں کھانا کھایا جائے۔ میں فرح اور حور کو لے کر ڈرائیو کرنے لگا۔ سگنل پر گاڑی سڑک پر بنے نشان سے ذرا آگے رکی تو ایک ٹریفک سارجنٹ نے آلیا۔

'لائسنس، رجسٹریشن؟'

میں لائسنس اور رجسٹریشن کی کتابیں نکالنے لگا۔

'فیضان اسے ابو کا نام بتا دیں، معاملہ نبٹ جائے گا۔' حور نے آہستگی سے مجھے ٹہوکا دیا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی ردِعمل ظاہر کرتا، پچھلی کھڑکی سے لگی فرح نے شیشہ نیچے کر کے سارجنٹ کو مخاطب کیا:

'وہ سیدھے ہاتھ پر دیکھیے، ساری گاڑیاں لائن سے آگے رکی ہوئی ہیں، آپ ہمارا ہی چالان کیوں کر رہے ہیں؟'

'فرح ان سے مت الجھو۔ فیضان آپ بتائیں ناں انھیں کہ آپ کرنل صغیر کے مہمان ہیں۔'

'ارے واہ، کرنل انکل کا نام کیوں درمیان میں لائیں۔ ہم خود نمٹ سکتے ہیں ان سے۔'

فرح نے غصے سے سارجنٹ کو گھور کر دیکھا۔ دونوں میں ہلکی سی چخ چخ کے بعد سارجنٹ نے ہمیں بغیر چالان کے جانے دیا۔

'دیکھا' فرح نے اپنے مسل کو ایسے پھلا کر دکھایا جیسے پنجہ کشی کا مقابلہ جیت آئی ہو۔ حور کچھ نہ بولی چہرہ سرخ کیے بیٹھی رہی۔

فرح میں مجھے وہ لچک دکھائی دی جو روزانہ کی زندگی کے جھمیلوں کے لیے ضروری ہے۔ یہ وہ فنکار تھا جو ہر کردار میں اس کی ضرورت کے مطابق ڈھل جاتا۔ وہ ایک اچھا نگینہ تھی جسے

تراش کر انگوٹھی میں جماتے دکھ نہ ہوتا۔ حور اس کے مقابلے میں کوہِ نور تھی۔ ایک ٹرافی، جس کمرے میں داخل ہو وہاں کا اجالا بڑھ جائے، میں الجھ سا گیا۔

ساجدہ کے کہنے پر میں نے اپنا قیام دو ہفتہ مزید بڑھوالیا۔

اب میرا زیادہ وقت حور اور فرح کے ساتھ گزرتا۔ نہ چاہنے کے باوجود میرا جھکاؤ لاشعوری طور پر فرح کی جانب ہونے لگا۔ حور اس تبدیلی سے لاعلم نہ تھی۔ جبکہ فرح غالبًا اپنے لاابالی پن میں ابھی طوفان کا رخ مڑ جانے سے لاعلم تھی۔ اپنے قدرتی وقار کے ساتھ حور نے نسبتاً پچھلی نشست سنبھال لی تھی۔ اس کے چہرے پر دُکھ سے زیادہ حیرت تھی، جیسے کوئی اَن ہونی اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہی ہو۔ میری حور سے گفتگو اب عموماً آنکھیں ملائے بغیر ہوتی۔ میرے فیصلے کی توجیح مشکل تھی۔ حور کو شاید پہلی بار ایسی صورتِ حال سے گزرنا پڑ رہا تھا۔

حور کمرے میں داخل ہوئی تو فرح پہلے سے بیٹھی ہوئی تھی۔

'اوہ' حور مڑ کر واپس جانے لگی۔

'ارے نہیں حور آؤ بیٹھو' میں نے اور فرح نے ایک ساتھ کہا۔ ذرا ردوکد کے بعد حور بیٹھ گئی۔ ہم تینوں ادھر، اُدھر کی ہانکنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ملازم چائے لے آیا۔ باتوں میں وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ عموماً فرح پہلے اٹھ جاتی تھی۔ آج حور نے پہل کی۔ معذرت کر کے اٹھی تو فرح کے پاس کچھ ٹھٹک سی گئی۔ چائے کے برتن فرح کی برابر والی تپائی پر پڑے تھے۔ جھک کر برتن اٹھائے اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ چہرے سے مجھے ایسا لگا جیسے اسے برتنوں کا یہ بوجھ بہت بھاری لگا ہو۔ لیکن اس پسپائی میں وہ وقار تھا کہ برتن اٹھائے اس کی وہ چند قدموں کی مسافت میں کبھی نہ بھول سکا۔

میں نے اپنا فیصلہ ساجدہ بھابی کو سنایا تو انھیں یقین نہیں آیا۔

'میرا خیال تھا میں تمھیں خوب سمجھتی ہوں' ساجدہ بھابی نے ہنس کر کہا۔

'بھئی دل کو کون سمجھائے' میں نے بن کر بہت فلمی سے انداز میں سینے پر ہاتھ رکھا اور جھک کر کورنش بجا لایا۔

'سوچ لیا ہے اچھی طرح، حور کی امی تو آس لگائے بیٹھی ہیں۔'

'ہاں ساجدہ سوچ لیا ہے۔ مجھے خود حور سے شرمندگی ہے۔ شکر ہے میں نے کسی لمحے کوئی ایسا عندیہ نہیں دیا تھا۔'

ساجدہ بھابی نے امی کو فوراً فون ملایا۔ امی بہت خوش تھیں۔ 'بس جو فیضان کو پسند ہے، مجھے اس کی پسند پر پورا اعتماد ہے' امی کا اصرار تھا کہ میں منگنی کر کے آؤں، پھر ربیع الاول میں وہ میرے ساتھ آ کر شادی کی تقریب کریں گی۔

منگنی کی تاریخ طے ہوگئی تو مصروفیت بڑھ گئی۔ میں اب بھی فرح اور حور کے گھر جاتا رہا۔ فرح کے وقار میں اضمحلال ضرور تھا مگر شکست خوردگی کی علامات ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتیں۔ وہ مجھ سے ویسے ہی ملتی رہی، جیسے میں آیا ہی فرح سے شادی کرنے کے لیے تھا۔ منگنی کے دن میں صبح سے ان ہی کے گھر تھا۔ بس ایک رسما سی بات پکی کرنی تھی۔ گھر گھر کے ہی لوگ تھے۔ حور کی امی نے فرح کو دلہن کی طرح تیار کرنے کی ضد کی۔ فرح اور حور میں فاصلہ بڑھ گیا تھا۔ لیکن ایسے لگتا تھا جیسے دونوں میں ایک غیر تحریری صلح ہو چکی تھی جن کی شرائط غالباً ان ہی دونوں کو پتا تھیں۔

فرح بن سنور کر باہر بیٹھک میں آئی تو بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں کہنی تک چوڑیاں تھیں، گورے ہاتھوں پر سرخ نیل پالش عجب بہار دکھلا رہی تھی۔

'بیٹا معاف کرنا، میں مہندی کی کون لے بھی آئی تھی، مگر جس نے مہندی لگانے کا وعدہ کیا تھا وہ عین وقت پر نہ آسکی۔' حور کی امی نے مجھ سے معذرت کی۔ میں آنٹی کی فراغ دلی، رواداری اور انسان دوستی دل میں سراہے بنا نہ رہ سکا۔ اس سے پہلے کہ کوئی جواب دیتا، حور نے اپنی امی کے ہاتھ سے مہندی کی کون لے لی۔ پھر میں نے انسانی جرأت، شائستگی اور عظمت کا ایک عجیب نظارہ دیکھا۔

'اگر آپ کی اجازت ہو تو میں لگا دوں مہندی؟' حور نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور میرے جواب سے پہلے ہی فرح کا ہاتھ تھام کر مہندی سے نقوش بنانے لگی اور میں سوچتا رہ گیا کہ دونوں میں اصل نگینہ کون ہے۔

پلے بوائے

'مجھے اس شخص سے ملنا ہے جس نے سیکس ایجاد کیا، اور معلوم کرنا ہے کہ آج کل وہ کس ایجاد پر کام کر رہا ہے۔' فراز نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اعلان کیا۔

فراز کا داخلہ ایسے ہی ہوتا ہے۔ چونکا دینے والا، بولڈ، اچھوتے جملے، مزاح سے لیس اور جملوں کی کھلی نوعیت۔ کمرے میں ایسے داخل ہوگا جیسے بہت جلدی میں ہو اور بس ایک دو فقرے اچھال کر آگے بڑھ جائے گا۔ لیکن آپ شرط لگا سکتے ہیں کہ وہ جم کر بیٹھے گا اور گھنٹوں بیٹھا رہے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے بیٹھنے کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی بے چین روح کرسی کے کنارے پر بیٹھی ستا رہی ہو۔ غالباً یہی اس کی زندگی کے فلسفے کا نچوڑ تھا، ایک آرام کرسی کے کنارے پر بیٹھی بے چین روح۔

فراز کے جملے پر سب ہنس پڑے۔

'کیوں ملنا چاہتے ہو اس موجد سے؟' سعدیہ نے ہنس کر سوال کیا۔

'میں اس کی اگلی ایجاد بازار میں آنے سے پہلے ہتھیا لینا چاہتا ہوں۔ میں اس کے تجربوں کا Guinea pig بننے کے لیے بے چین ہوں۔' فراز نے فرضی بے چینی سے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ آنکھوں سے ذہانت ٹپک رہی تھی، بلا کا حاضر جواب۔ گفتگو میں شوخی کی

آمیزش، لیکن اس کی گفتگو بہت جنس زدہ ہوتی تھی۔ لگتا تھا اس کا محور، طبیعت کا میلان، زندگی کا فلسفہ صرف اس کے معاشقوں، فتوحات اور جنس کے گرد گھومتا تھا۔

'فزیالوجی کا لیکچر ہے، میں اسے نہیں چھوڑ سکتا' احمد یہ کہ کر اٹھا تو ساتھ شاہد، اشرف، فرزانہ اور طاہرہ بھی اٹھ گئے۔ فراز سے امید کم ہی تھی کہ لیکچر میں جاتا۔ مجھے بھی فزیالوجی بہت خشک اور بور مضمون لگتا۔ میں فراز، سعدیہ اور یاسمین بیٹھے رہ گئے۔ یہ ہمارا اندرونی گروہ تھا۔ میں اور فراز اسکول سے ایک دوسرے کے دوست تھے باقی سب یہیں میڈیکل اسکول میں دوست بنے۔ خصوصاً ہم چاروں کی کیمیا ایک دوسرے سے خوب ملی۔ سارے پراجیکٹ ساتھ مل کر کرتے۔ اکثر پڑھائی بھی گروپ کی شکل میں ہوتی۔ اس اندرونی گروہ کے بیرونی دائرے میں اشرف، فرزانہ، طاہرہ، احمد اور شاہد شامل تھے۔

'خیر محمد، بابا چائے تو دو' میں نے کینٹین کے لڑکے کو آواز دی۔ میرے منہ سے جیسے ہی خیر محمد نکلا، یاسمین کو ہنسی آ گئی۔ یاسمین کی لغت میں خیر محمد صرف کسی بڑی عمر کے آدمی کا نام ہو سکتا ہے۔ کسی نوجوان کو یہ حق حاصل نہیں کہ اس کا نام خیر محمد ہو۔ لیکن ہر بڑی عمر کا خیر محمد بھی کبھی تو لڑکپن سے گزرا ہوگا۔ اس پر جواب ملتا کہ لڑکپن میں ان کا نام کچھ اور ہونا چاہیے۔ مثلاً بچپن میں یہ خیرو کہلائیں اور بڑے ہو کر خیر محمد۔ اسی قسم کی لایعنی گفتگو اور منطق میں دن گزر جاتا۔

'فراز تم کل رات بارہ بجے تک غائب تھے، کہاں رہے؟' میں نے تجسس سے پوچھا۔

'میں یہی سوچ رہا تھا کہ تم کب پوچھو گے' فراز دفورِ شوق میں کرسی پر کچھ اور آگے سرک آیا۔

'بس کچھ نہ پوچھ یار۔ کیا زبردست لڑکی تھی۔ بہت اچھا وقت گزرا۔ یہ اس کے ساتھ میری دوسری ڈیٹ تھی اور۔۔' فراز نے جملہ جان بوجھ کر درمیان میں ادھورا چھوڑ دیا۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ یاسمین اور سعدیہ کرید کرید کر پوچھیں کہ پھر کیا ہوا۔ میں تو چپ رہا، انجان بن گیا، وہ دونوں پھر اس کی چال میں پھنس گئیں۔

'تو ہوا کیا؟ تم دونوں مل کر فلسفہ بگھارتے رہے یا اسے بھی بہن بنا آئے؟' یاسمین کے جملے پر دونوں لڑکیاں ہنسی سے دہری ہو گئیں۔

'تم دونوں صرف جل رہی ہو۔ کڑھو، کڑھو، ظاہر ہے ہر بات میں کھل کر تو بیان نہیں

کر سکتا، شرمیلا ہوں۔' فراز نے چھوٹی انگلی دانت میں دبا کر شرمانے کی بھونڈی اداکاری کی۔

'رہنے دو، دور کے ڈھول سہانے ہیں' میں نے جل کر کہا۔

'چلو تم ایسا ہی سمجھ لو' کمبخت نے کرسی پر دراز ہو کر پاؤں پھیلا دیے اور آنکھیں بند کر کے ایسے مسکرانے لگا گویا گزشتہ رات ایک فلم کی مانند اس کی نگاہوں کے سامنے گزر رہی ہے۔ انسانی نفسیات سے خوب کھیلتا تھا۔ جانتا تھا کہ اس نے کہانی جس موڑ پر چھوڑی ہے، لڑکیاں مزید کے لیے بے چین ہوں گی۔

'ارے یہ ایسے ہی جل رہا ہے، تم قصہ سناؤ' یاسمین نے مجھے تنبیہی نگاہوں سے گھورا۔

'بھئی کیا سناؤں، کوئی نئی بات ہے کیا۔ جہاں جاؤں لڑکیاں آگے پیچھے، تنگ آ گیا ہوں میں ان سے۔ بھئی نہیں ہے اب میرے پاس وقت ان فضولیات کے لیے۔' فراز نے مصنوعی اکتاہٹ کا اظہار کیا۔

یہ بات شاید سچ بھی تھی۔ کم بخت کو قدرت نے کچھ زیادہ وقت لگا کر تراشا تھا۔ لانبا، کسرتی بدن، کھلتا ہوا گندمی رنگ، ذہانت سے بھرپور شوخ آنکھیں۔ پھر موصوف اپنے اوپر خاصا وقت بھی خرچ کرتے۔ نتیجہ یہ کہ جہاں میں، شاہد، احمد اور اشرف وغیرہ صنف نازک سے دوستی کے لیے ترستے تھے۔ وہاں یہ حضرت، کمبخت کا جادو ایسے چلتا کہ ان کے پاس چناؤ کی عیاشی تھی۔ 'اس سے دوستی کروں گا، جبکہ اس سے۔۔ چلو مل کر دیکھ لیتے ہیں۔' پھر ان فتوحات کے قصے فخر سے گروپ میں بیان ہوتے۔ لڑکیوں کی موجودگی کی وجہ سے یہ پوسٹ مارٹم دائرہ اخلاق میں رہتا۔ یہ ہمارا میڈیکل کا چوتھا سال تھا۔ اگلے سال جون کے مہینے میں فارغ ہو کر 'پورا ڈاکٹر' بن جاتے۔ اس لیے اب کالج میں تیزی سے جوڑے بن رہے تھے۔ مگر فراز کبھی ایک لڑکی کے ساتھ مستقل مزاجی سے تعلقات نہ رکھتا۔

'ایک دفعہ شادی ہوگئی تو پھر کیا کرو گے، تمھیں تو بہت چھوٹی رسی سے باندھ کر رکھنا پڑے گا، کھونٹے سے بہت دور نہ جا سکو گے جگالی کرنے۔' سعدیہ نے ہنس کر کہا۔

'پاگل ہوئی ہو، شادی کون کر رہا ہے۔ میں فی الحال مذہبِ خوشہ چینی کا پیروکار ہوں۔' فراز کی گفتگو میں ایسی سنجیدگی تھی جیسے خوشہ چینی واقعی کسی چینی مذہب کا نام ہو۔

'شادی تو تمھارے اچھے بھی کریں گے، تمھاری اماں بس تمھارے بڑے ہونے کا انتظار کر رہی ہیں۔' میں نے ہنس کر کہا۔

'ہاں یار، ان سے بڑا خطرہ ہے، بڑے جذباتی بلیک میلنگ کے داؤ چلاتی ہیں، پتہ نہیں انھیں بہو کا ایسا کیا شوق ہے۔' فراز کی بے چارگی پر ہم تینوں ہنس پڑے۔

فراز کی بات پوری ہونے سے پہلے خیر محمد یا خیرو چائے لے آیا۔ میڈیکل کالج کی یہ کینٹین باہر والی کینٹین کہلاتی تھی۔ بہار اور خزاں کے مہینوں میں یہ کینٹین خوب چلتی۔ جب دھوپ کی تپش یا موسم کی سرد مہری نا قابلِ برداشت ہو جاتی تو کالج کی عمارت کے اندر پہلی منزل پر واقع کینٹین بھر جاتی۔ ستمبر کی اس خوبصورت دوپہر باہر والی کینٹین میں چاروں طرف کرسیوں پر سفید کوٹ نظر آ رہے تھے۔ کچھ کرسیوں کی پشت پر اسٹیتھو سکوپ ٹنگے تھے۔ زیادہ آزاد خیال اور بے تکلف لڑکیوں نے سفید کوٹ اتار دیے تھے اور رنگ برنگی شلوار قمیض اور کرتا جینز کی قوسِ قزح بکھری تھی۔

کسی بدن سے بدن کی ہو گفتگو
یہ خود کلامی سے بہت بہتر ہے

فراز نے بغیر کسی تمہید یا وجہ کے ایک بے ہودہ شعر گنگنایا۔ میرا چہرا سرخ ہو گیا، سعدیہ دوسری طرف منہ پھیر کے ہنسنے لگی۔ جبکہ یاسمین شعر کا مزاج نہ بھانپ سکی۔

'کیا مطلب، کون خود کلامی کر رہا ہے، کس کی گفتگو؟' اس کے سوال پر سعدیہ کو اچھو لگ گیا، تو بات یاسمین کی سمجھ میں آ گئی۔

'فراز کتنے گندے ہو تم' اس نے منہ بنایا۔

'شعر کی داد نہیں دے رہیں۔ کتنی باریک بات بغیر کسی عریانیت کے کہہ دی ہے؟'

'یہ بغیر عریانیت ہے تو پھر عریانیت اور کیا ہو گی' میں نے تاؤ کھا کر پوچھا۔

'تم ایسے ہی مولانا بنے رہنا، سعدیہ تم اپنے ایمان سے بتاؤ اچھا شعر ہے یا نہیں۔'

سعدیہ صرف مسکراتی رہی، منہ سے کچھ نہ بولی۔

'میں اس چھچھور پن میں شامل نہیں ہو سکتا' میں یہ کہہ کر اٹھ گیا۔ میرے اٹھتے ہی محفل

درہم برہم ہوگئی۔

حسبِ معمول شام میں فراز میرے گھر آدھمکا۔ فراز سے میری دوستی یک جان دو قالب والی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے سبھی رازوں کے امین تھے۔ ایک دوسرے کی کمزوریوں اور مضبوطیوں سے آگاہ۔ دونوں ایک دوسرے کے گھر کا فرد بن گئے تھے۔ فراز کے والدین میرے ساتھ بہت محبت اور شفقت کا برتاؤ کرتے، جبکہ میرے والدین بھی فراز کے نام کی مالا جپتے۔

'یہ صبح کیا حماقت تھی، تم اٹھ کر کیوں چل دیے تھے؟' فراز نے اپنی موٹر سائیکل اسٹینڈ پر کھڑے کرتے ہوئے پوچھا۔

'یار تو کس طرح اس قسم کے اشعار اور لطیفے لڑکیوں کی موجودگی میں سنا دیتا ہے، وہ کیا سوچیں گی۔' میرا صبح والا کسیلا لہجہ برقرار تھا۔

'لڑکیاں کیا سوچیں گی؟' اس نے حیرت سے سوال کیا، گویا میں نے کوئی نہایت کم عقلی کی بات کہہ دی ہو۔

'لڑکیوں کا جسم نہیں ہوتا، یا دل و دماغ کی کمی ہے۔ یا پھر انھیں جذبات اور احساسات سے عاری پیدا کیا گیا ہے۔ یہ بتاؤ ان دونوں نے برا منایا۔ سعدیہ ہنستی رہی۔ یاسمین دل میں مزے لے رہی تھی۔ اگر وہ برا مناتیں تو میں ایک دو مرتبہ کے بعد نہیں سنا سکتا تھا۔ تم اسی وہ کیا سوچیں گی میں الجھے رہے تو ہمیشہ لنڈورے رہو گے۔'

'پھر بھی فراز مجھے تو بہت عجیب لگتا ہے۔'

'چلو تو پھر تم شرماتے رہو۔ ایسے ہی اود بلاؤ بنے رہنا۔ پھر پوچھتے ہیں یار مجھ سے کوئی لڑکی فری کیوں نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ تم میں انھیں اپنا بھائی نظر آتا ہے۔ ذرا بولڈ قسم کے تیز، معنی خیز لطیفے سناؤ، آہستہ آہستہ تکلف کا پردہ گر جائے گا تو بات آگے چلے گی۔ ایسے تو وہ تم سے پانچ ملاقاتوں میں بھی نہ پھنستی۔'

مجھے فراز کا جملہ جارحانہ لگا مگر میں کچھ بولا نہیں۔ بولتا بھی کیا۔ اس کی دوستی روزانہ ایک نئی لڑکی سے ہوتی تھی جبکہ میرا ابھی تک روزہ تھا۔ یقیناً اس کی بات میں وزن رہا ہوگا، کامیابی اپنا ثبوت خود ہوتی ہے۔

'اچھا یہ بتا کل کچھ کیا بھی یا ایسے ہی کھانے پر خرچہ کر کے آ گیا' میں نے فراز کو کریدا۔
'بس میاں کیا بتائیں' کمینے نے ایک گہری سانس لی۔ 'یار یہ اللہ میاں نے لمس میں اتنی لذت کیوں رکھی ہے، ابھی کچھ دن ہوئے میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ تخلیق کا مقصد جنس ہے، اور جنس کا مقصد تخلیق، کیا واقعی یہ سچ ہی تو نہیں۔ اگر تخلیق برائے جنس ہے تو سمجھ لو میں اس عبادت میں پورے خضوع و خشوع کے ساتھ گھٹنوں گھٹنوں دھنسا ہوا ہوں۔'

مجھے لگا فراز کی رال ہی ٹپک پڑے گی۔

'یار ہم تو ایسے ہی جڑ یلے پھر رہے ہیں، میرے کونے کب جھڑیں گے؟'

'جب تک تم ایسے نوک دار اور کانٹے دار بنے رہو گے، خود کلامی کا شکار رہو گے، لڑکیاں قریب آتی بھی ہیں تو تمھارے کانٹوں سے گھبرا کر بھاگ جاتی ہیں۔'

فراز کافی دیر تک مجھے اسی اول فول قسم کا لیکچر دیتا رہا، یوں کہیے کہ مجھے جلاتا رہا۔ اپنی فتوحات کے تذکرے سے اس نے اپنی گفتگو کو آراستہ کیا، مثالوں سے مضمون کو واضح کیا۔ میں ایک عقیدت مند پجاری کی مانند ڈنڈوت لیے اس دیوتا سے سبق لیتا رہا۔ کبھی کبھی تو لگتا تھا کامل سوترا کا کوئی باب سنا رہا ہے۔ یہ بات واضح تھی کہ اس کی کتابِ زندگی میں جنس کا باب بہت زرخیز تھا۔

ہمارے روز و شب یونہی گزرتے رہے۔ گھر سے کالج، کالج میں کینٹین، لیکچر، پراجیکٹس، لڑکیاں، ہنگامے۔ زندگی بہت پرلطف، ہنگامہ خیز اور آراستہ تھی۔ ایم. بی. بی. ایس کا کورس ختم ہونے میں صرف چھ ماہ رہ گئے تھے۔ دو مہینے کے بعد کالج بند ہو جاتا پھر آخری چار ماہ گھر بیٹھ کر امتحان کی تیاری کرنی تھی۔ ماحول میں آہستہ آہستہ سنجیدگی کا رنگ گھل رہا تھا۔ امتحان کی فکر، پھر امتحان کے بعد کے منصوبے۔ میں اور فراز اکثر شاموں کو ساتھ پڑھتے۔ ایک ہفتے تک متواتر میں اس کے گھر جاتا پھر اگلے ہفتے وہ میرے گھر پڑھنے آتا۔ یاسمین اور سعدیہ کا بھی وطیرہ ایک دوسرے کے ساتھ تھا۔

اسی دوران فراز کی والدہ نے مجھے اعتماد میں لے کر بتایا کہ انھوں نے فراز کے لیے ایک

لڑکی دیکھ رکھی ہے جو انھیں بہت پسند ہے۔ انھوں نے فراز کو تصویر بھی دکھا دی ہے، فراز کی بہن اسے گھر بھی بلا سکتی ہے کہ فراز بھی اس سے مل لے۔ لیکن فراز مستقل آنا کانی کر رہا تھا۔ آنٹی کا بہت اصرار تھا کہ اگر فراز کو خود کوئی اور لڑکی پسند ہے تو وہ انھیں بتا دے کہ وہ اس سے بات آگے بڑھائیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ ہمارے امتحانوں کے ایک ماہ بعد فراز کی شادی کر دیں۔ مجھے تو بہت خوشی ہوئی۔ میں نے آنٹی سے وعدہ کر لیا کہ فراز کو سمجھاؤں گا اور معلوم کروں گا کہ معاملہ کیا ہے۔

جمعرات کے دن سال کی آخری کلاس تھی۔ پھر چار ماہ چھٹی اور اس کے بعد امتحانات۔ ہم لوگوں کی ٹولی حسبِ عادت باہر کینٹین میں دھوپ سینک رہی تھی۔

'میں تم لوگوں کو بتانا بھول گیا۔ لگتا ہے امتحانوں کے دو تین ماہ بعد فراز ہم لوگوں کو ویسے کے چاول کھلائے گا' میں نے دانستہ ذکر چھیڑا۔

'بکومت' فراز نے الجھ کر کہا۔

'واقعی فراز۔ اتنی بڑی خبر اور وہ بھی اتنی خفیہ، لڑکی کون ہے؟' سعدیہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

'سعدیہ کسی کی شادی نہیں ہو رہی، اس کی تو بکواس کی عادت ہے'، فراز زیادہ خوش نظر نہیں آ رہا تھا۔

'یہ بات درست ہے کہ شادی ابھی تک طے نہیں ہوئی ہے، لیکن آنٹی امتحانات کے دو تین مہینوں بعد اس بیل کو بھی کسی کھونٹے سے باندھنا چاہتی ہیں' میں نے وضاحت کی۔ 'لیکن یہ بھائی کسی طرح راضی نہیں ہوتے۔ اگر کسی کو پتہ ہے کہ موصوف کسی اور لڑکی میں سنجیدہ ہیں تو سامنے آ کر اعلان کرے' میں نے ماحول کو ہلکا پھلکا رکھنے کے لیے ذرا ڈرامائی انداز میں کہا۔

سب فراز کے پیچھے پڑ گئے، مگر فراز کا عذر وہی رہا کہ ابھی اتنی جلدی کیا ہے۔ 'میں ابھی مستقل ہونے کے لیے بالکل تیار نہیں ہوں۔'

اتنی دیر میں خیر محمد عرف خیرو چائے کے برتن اٹھانے آ گیا۔ فراز نے اس کو سو کا نوٹ نکال کر دیا۔ خیرو جب باقی پیسے واپس لایا تو نوٹ تو فراز کے ہاتھ میں آ گئے، دو سکے میز پر گر پڑے۔

'ارے یہ اتنا بڑا سکہ کون سا ہے' میں نے ایک نسبتاً بڑا سکہ اٹھا کر دیکھا۔

'صاحب یہ ایک روپے کا نیا سکہ نکلا ہے' خیر محمد نے اطلاع دی۔

'دکھاؤ، دکھاؤ، سب نے ہی سکہ کا معائنہ کیا۔

'لیکن یہ تو کھوٹا ہے، دیکھو ادھر سے کیسا زنگ آلود ہوگیا ہے' سعدیہ نے توجہ دلائی۔

'بھئی ایک روپے کا سکہ تو کھوٹا نہیں ہونا چاہیے، ایک پیسہ، پانچ پائی یا چونی تک تو ٹھیک ہے۔' یاسمین کی منطق بہت عجیب تھی۔

'مجھے دکھاؤ'، فراز نے ہاتھ بڑھا کر سکے کو غور سے دیکھا پھر اٹھ کر دور جھاڑیوں میں پھینک دیا۔

'یہ کیا کیا، کھوٹے سکے نے تمھارا کیا بگاڑا تھا؟'

'پتہ نہیں بس مجھے چڑ ہے کھوٹے سکے سے' فراز کا لہجہ بہت اجنبی سا تھا۔

تھوڑی دیر میں محفل برخواست ہوگئی۔ ادھر امتحان قریب آرہے تھے، ادھر فراز کی والدہ تلاشِ بہو میں سرگرداں تھیں۔ فراز کی بہن سے مجھے مستقل کنٹری مل رہی تھی۔ جب بھی نئی تصویریں دکھائی جاتیں یا کسی بہانے لڑکی سے فراز کا تعارف کرایا جاتا تو ہر دفعہ فراز کوئی نہ کوئی نقص نکال لیتا۔ جب پانی سر سے اونچا ہوگیا اور گھر میں تلخی بڑھنے لگی تو فراز نے تنگ آکر کہہ دیا 'آپ کو جو پسند آئے اسے بہو بنا کر گھر لے آئیں، اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔' اسے فراز کی سعادت مندی سمجھا گیا۔ ویسے وہ تھا بھی سعادت مند۔ ویسے کتنا ہی کھلنڈرا اور ہلے بوائے ہو، اپنی والدہ کی کسی بات سے انکار اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

امتحان بھی ہوگئے اور ایک ماہ میں نتیجہ بھی آگیا۔ توقع کے مطابق سب ہی پاس ہوگئے۔ اب اچانک فراز، ڈاکٹر فراز ہوگئے۔ لیکن ابھی انٹرن شپ شروع ہونے میں تین مہینے تھے اور فراز کی امی اس وقفے سے فائدہ اٹھا کر شادیانے بجوانے کے چکر میں تھیں۔ فراز کے گھر اب بہت گہما گہمی رہتی۔ فہرستیں بن رہی ہیں، ہر وقت جوڑوں کا تذکرہ ہے۔ کھانے میں کیا ہوگا، بارات کس وقت اور کیسے جائے گی۔ بس ہر وقت پروگرام بنتے اور تبدیل ہوتے رہتے۔ یاسمین اور سعدیہ بھی بھرپور طریقے سے شریک تھیں۔ اس درمیان میں ایک اور اچھی خبر یہ ملی کہ سعدیہ کا

بھی رشتہ ہو گیا اور اس کی شادی بھی انٹرن شپ سے پہلے قرار پائی۔ سعدیہ کی امی نے تو صاف کہہ دیا کہ جس طرح سب فراز کی شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں، اس سے زیادہ سعدیہ کے لیے دوڑ دھوپ کرنی ہوگی۔ 'بیٹا لڑکی کا معاملہ ہے تمھیں تو پتہ ہی ہے' انھوں نے مجھے اور فراز کو بہت رسان سے سمجھایا۔ لگتا تھا فراز اپنی شادی سے زیادہ سعدیہ کی شادی سے خوش تھا۔ اپنی شادی کے معاملے میں تو لگتا تھا اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ ہم لوگ مستقل اسے چھیڑتے رہتے کہ اب عیش ختم۔ بہتر ہے وہ ابھی سے صراطِ مستقیم پر چلنا شروع کر دے!

فراز کی مہندی بدھ کی شام میں جانی تھی۔ میں صبح سے چکرایا پھر رہا تھا۔ وین کا انتظام، پھلوں کے ٹوکرے، مٹھائیوں کے ڈبے وغیرہ۔ فراز کا کوئی بھائی نہیں تھا اور بزرگ والد جوڑوں کے درد کے مریض تھے۔ میرے حصے میں کچھ زیادہ ہی کام آ گیا تھا۔ سعدیہ اور فراز کے کاموں کے بیچ میں اتنا مصروف رہا کہ فراز سے تو پچھلے دو دن سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔ شام چار بجے فراز کی بہن کا فون آیا کہ میں سب کام چھوڑ کے فوراً گھر پہنچوں، فراز کی طبیعت بہت خراب ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پھر خیال ہوا کہ اس امتحان کی گھڑی میں مکر کر رہا ہے کہ شاید یہ لمحہ ٹل جائے۔ مگر فراز کی بہن فون پر رو رہی تھی اور اس کا لہجہ معاملے کی سنگینی کی چغلی کھا رہا تھا۔ بھاگم بھاگ فراز کے گھر پہنچا تو گھر کے باہر ہی سے رونے اور بین کی آوازیں آنے لگیں۔ میں بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا تو فراز کے والد مجھ سے لپٹ گئے:

'سب ختم ہو گیا بیٹے، سب ختم ہو گیا، فراز بہت دور چلا گیا۔'

اندر سے فراز کی بہن اور والدہ کے رونے کی آواز مجھے حواس باختہ کر رہی تھی۔

'مگر کیوں انکل، کیا ہوا اس کو' میرے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

فراز کے والد سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا، وہ بھد سے زمین پر بیٹھ گئے یا گر گئے۔ منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ دونوں آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ جیب سے ایک کاغذ نکال کر میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔ کپکپاتے ہاتھوں سے کاغذ کو سیدھا کرنے کی کوشش میں، میں نے اسے گرا دیا۔ اٹھانے کو جھکا تو انکل نے وہیں بٹھا لیا۔

’پیارے ابو، مجھے معاف کر دیجیے گا۔ میں اتنا بڑا صدمہ آپ کو دے رہا ہوں کہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ابو، قدرت نے جہاں اتنی نعمتوں سے نوازا، وہیں ایک کجی بھی رکھی۔ اب تک تو میں اسے بڑبولے پن کی آڑ میں چھپانے میں کامیاب رہا ہوں، مگر اب یہ مزید نہیں چھپ سکے گا۔ اب یہ کھوٹا سکہ کسی عروسہ کی انگلیوں پر زنگ چھوڑ جائے گا۔ کھوٹا سکہ کسی کام کا نہیں ہوتا ابو، مجھے معاف کر دیجیے گا۔ میں اتنا بہادر نہیں جتنا آپ سمجھ بیٹھے۔‘

خط کیا تھا ایٹم بم تھا۔ میرے دماغ میں اس کے الفاظ بگولوں کی طرح گردش کر رہے تھے۔ ’کھوٹا سکہ کسی کام کا نہیں ہوتا، کھوٹا سکہ کسی کام کا نہیں ہوتا‘، کون مجھ سے کیا کہہ رہا ہے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس ایک جملے کے علاوہ چاروں طرف مہیب سناٹا تھا، جس نے سب آوازیں بند کر دی تھیں۔

’بیٹا تمھیں تو معلوم رہا ہوگا، تم ہی اشارتاً بتا دیتے‘ فراز کے والد آنسوؤں کے درمیان گلوگیر لہجے میں مجھے جھنجھوڑ رہے تھے۔

سود و زیاں

آپ چاہے جس چیز کی قسم لے لیں میں نے اسے بالکل نہیں دیکھا تھا۔ بس اچانک کود کر سامنے آ گیا، جیسے کوئی جن بھوت نمودار ہو جائے۔ ابھی نہیں تھا، اب ہے۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں گاڑی ذرا تیز رفتاری سے چلاتا ہوں، مگر اب ایسا بھی نہیں کہ پورا چھ فٹ کا آدمی ہی نظر نہ آئے۔ خاص کر اس سنسان سڑک پر جہاں اس وقت دوسرا کوئی کوسوں دور تک نہیں تھا۔ میں قسمیہ کہتا ہوں کہ وہ درخت کے پیچھے انتظار میں بیٹھا تھا اور جیسے ہی میری گاڑی نزدیک پہنچی وہ کود کر گاڑی کے سامنے آ گیا۔ ظاہر ہے ٹکر لگی اور موصوف چاروں خانے چت تھے۔ میں نے با آواز ایک موٹی گالی سے نوازا۔ نہ معلوم اس کو، خود کو یا ایک عمومی برانگیختگی کا اظہار۔ ایک لمحے کو دل میں خیال آیا نکل لوں۔ دور دور تک اور کوئی نہیں تھا، نہ کوئی گاڑی نہ راہ گیر گرمیوں کی سنسان دوپہر میں گرم ہوا کے بگولے سڑکوں پر راج کر رہے تھے۔ شاید خودکشی کرنا چاہ رہا ہے تو مجھے کیا تکلیف ہے کہ اس کے شیڈول میں دخل دوں۔ مگر شاید وہ جو ہر آدمی کے خمیر میں نیکی کا ایک شائبہ گندھا ہوتا ہے وہ غالب آ گیا۔ میں لپک کر گاڑی سے نیچے اترا کہ دیکھوں زندہ ہے یا گزر گیا۔ جیسے ہی اس کی نبض پر ہاتھ رکھا وہ تو اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی پھرتی قابل دید تھی۔ لگتا ہے بالکل چوٹ نہیں لگی تھی۔ بچ گیا، اب یہ ضرور کچھ پیسے مانگے گا۔ لگتا ہے یہ اس کا

طریقۂ واردات ہے۔ مگر کس قدر خطرناک اس میں تو جان بھی جا سکتی ہے۔

’اندھے ہو دیکھتے نہیں۔ بیچ دوپہر کا وقت ہے کوئی اندھیرا تو نہیں کہ تمھیں نظر نہ آئے پھر اچانک کیسے گاڑی کے سامنے آ گئے؟‘ میں اس پر برس پڑا۔ وہ انگریز کہتے ہیں ناں کہ حملہ ہی بہترین دفاع ہے۔ سو اس سے پہلے کہ وہ کوئی مطالبہ کرے میں اس پر چڑھ دوڑا۔ ویسے دیکھا جائے تو یہ انگریز بھی اس مقولے پر کچھ زیادہ ہی ایمان لے آئے ہیں۔ اب تو ناکردہ حملوں کا بھی دفاع کرنے لگے ہیں۔ کس کو وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں۔ میرے خیال میں تو طاقت بہترین دفاع ہے۔ مگر میرا خیال پوچھتا کون ہے۔ خیر آیئے واپس اس معاملے کی طرف لوٹتے ہیں۔ میری ڈانٹ سن کر وہ مسکرا دیا، جی مسکرا دیا۔ ایک لمحے کو تو میں چکرا گیا۔ دیکھیے ہر بات کا ایک متوقع ردِعمل ہوتا ہے، آپ ہی فیصلہ کیجیے بھلا اس وقت مسکراہٹ کسی طرح بھی ایک نارمل ردِعمل تھی۔ مسکراہٹ تقریباً ہر وقت اور ہر معاملے میں نارمل ردِعمل ہے، البتہ جب کہ وہ صاحبِ معاملہ کو تپا دے۔ سچ پوچھیے تو اس کی مسکراہٹ نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔

’کیا بالکل پاگل ہو، مسکرا رہے ہو۔ ارے مر بھی سکتے تھے، مرنے کا شوق ہے تو ٹرین کے آگے کود و کہ نہ وہ وقت پر آتی ہے نہ وقت پر جاتی ہے اور نہ ہی بر وقت رک پاتی ہے، سمجھو تمھارا کام بن جائے گا۔‘

’پاگل نہیں ہوں، جن ہوں۔‘

’کیا ہوں؟‘

’جن، جنّات، کیا آپ اونچا سنتے ہیں۔‘

’بہروپیا ہے کمبخت، کسی اور مشکل میں نہ پڑ جاؤں‘ یہ سوچ کر میں پلٹا کہ گاڑی میں بیٹھ کر نکل لوں۔

’ارے کہاں جا رہے ہیں میں مذاق نہیں کر رہا۔ میں واقعی جن ہوں، شہزاد نام ہے‘ اس کا لہجہ روہانسہ تھا۔ ’آپ کا امتحان مقصود تھا اس لیے آپ کی گاڑی کے آگے کود پڑا۔ اگر آپ چھوڑ کر بھاگ نکلتے تو کچھ نہ ہوتا۔ لوٹ پوٹ کر میں اٹھ کھڑا ہوتا، اگلے مسافر کا انتظار کرتا۔ اب جب کہ آپ امتحان میں پورے اترے ہیں تو انعام تو لیتے جایئے۔‘ ادھیڑ عمر کا آدمی، عام سی

شکل، میانہ قد، گٹھا ہوا جسم، سرمئی شلوار قمیض، نہ صاف نہ ملگجی، چہرے پر ہلکی خشخشی داڑھی اور پیر میں کینوس کے جوتے۔ اور دعویٰ یہ کہ میں جن ہوں!

'تم جن ہو اور میں سلیمان' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا اور گاڑی کا دروازہ کھولا۔

'اچھا یقین نہیں آتا تو ادھر دیکھیے' یہ کہہ کر اس نے اپنی قمیض اٹھا دی۔

'کسی جن کا لہجہ اتنا ملتجی کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ سوچ کے میں اسے نظر انداز کرنے لگا تھا کہ کن انکھیوں سے اس کے پیٹ پر نظر پڑی تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ قمیض کے نیچے بدن کی جگہ ایک خلا ہے، کچھ ہے ہی نہیں۔ واقعی، سامنے کا دامن کیا اٹھا، پیچھے کا دامن ہوا میں لہراتا نظر آرہا ہے۔ یا اللہ یہ کیسی نظر بندی ہے۔ میں نے یقین کرنے کو مکا بنا کے اس کے پیٹ میں مارنا چاہا تو وہ آر پار ہو کر پچھلے دامن کو جا لگا۔ میں سائنس کا طالب علم ہوں جن اور بھوت کی حماقت پر بالکل یقین نہیں مگر اس وقت سانس لینا بھی بھول گیا، بدحواسی میں چابی ہاتھ سے گر پڑی۔

'ارے پلکیں تو جھپکا لیں میں آپ کا دوست ہوں۔ مجھے حکم ہے کہ آپ کی نیک طبعی کا آپ کو مناسب انعام دیا جائے۔' جن نے جھک کر میری چابی اٹھائی اور میرے ہاتھ میں پکڑا دی۔

'کس کا حکم ہے؟'

'یہ بتانے کا حکم نہیں۔'

'مجھے کچھ انعام و نام نہیں چاہیے' میری آواز میں خوف در آیا تھا۔

'تو پھر ہم آپ کو زبردستی اپنی مرضی کا انعام دیں گے۔ دیکھیے آپ کو دو انعامات کی صلاح ہے۔ ایک ایسی خواہش پوری کی جائے گی جس سے آپ کو دائمی خوشی ملے۔ جو چاہیں مانگ لیں۔ عزت، شہرت، دولت، صحت، عورت، اولاد، تعلیم سب اس بانٹنے والے کے تصرف میں ہے۔ بس خیال رہے کہ ایک خوشی پوری ہوگی۔ جو مانگو گے وہ ملے گا اور رہتی زندگی وہ تمھارا اثاثہ رہے گا، ختم نہیں ہوگا۔'

'تم نے کہا تھا دو انعامات ہیں، دوسرا کیا ہے؟' اب میری آواز میں دلچسپی اور دبا دبا جوش تھا۔ اچانک امکانات کی ایک دنیا کھل گئی تھی۔ خواہشوں کے چراغ دماغ میں جلنا شروع

ہو گئے تھے۔ میں نے بے چینی سے ہاتھ ملے۔

'دوسرا انعام ذرا دشوار ہے' جن کے لہجے میں ہچکچاہٹ تھی۔ 'دوسرا انعام دراصل ایک غم کی صورت میں ہے۔ آپ کوئی ایک غم چن لیجیے۔ وہ زندگی بھر آپ کے ساتھ چمٹا رہے گا۔ لیکن اس کی وجہ سے پھر دوسرے غم بہت کم ہو جائیں گے، دور بھاگیں گے، غم سے مکمل نجات تو خیر پھر بھی نہیں ہو گی۔'

'غم چن لوں یہ کس قسم کا انعام ہے'، خواہشوں کا چراغاں جلنے سے پہلے ہی بجھنا شروع ہو گیا۔ ایک دھڑام کی آواز کے ساتھ محل تعمیر سے پہلے ہی ڈھے گیا۔ کاش یہ آواز جن تک بھی پہنچی ہو۔

'ذرا غور کیجیے، جو غم آپ کو ملتے ہیں ان میں آپ کو چناؤ کا حق نہیں ہوتا۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں سے اکثر آپ نے خود کمائے ہوتے ہیں، مگر دینے والا آپ سے پوچھ کر نہیں دیتا۔ اس سے بڑھ کر انعام کیا ہو سکتا ہے کہ اپنی مرضی کا غم ملے؟' جن مصلحانہ انداز میں سمجھا رہا تھا۔

'دیکھو میاں مجھے غم وم نہیں چاہیے۔ مجھے میرے راستے پر جانے دو اور تم اپنا راستہ پکڑو، کوہِ قاف میں پریاں انتظار رہی ہوں گی۔' میں واقعی اندر سے ڈر گیا تھا۔

'مشکل یہ ہے کہ آپ خود نہیں چنیں گے، تو دونوں انعامات آپ کی تقدیر میں لکھ دیے جائیں گے۔ کیا معلوم کیا لکھ دیا جائے۔ بہتر کیا ہے اَن دیکھی خوشیاں اور غم ملیں یا اپنی تقدیر کا قلم اپنے ہاتھ میں رہے۔ میرا مشورہ ہے کہ اس موقع کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ کم از کم خوشی اور غم اپنی مرضی کے تو ہوں گے۔

کیا کروں نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن، آپ ہوتے تو کیا کرتے؟

'دیکھو یہ بہت گمبھیر سوالات ہیں۔ مجھے کچھ وقت چاہیے۔ اس افراتفری میں کچھ مانگ بیٹھوں گا جو میرے مزاج کے مطابق بھی نہ ہو، ساری عمر کا پچھتاوا رہ جائے گا۔ مجھے کچھ سوچنے کے لیے وقت درکار ہے۔' میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔ یہاں سے نکلوں تو پھر کوئی تدبیر کروں گا۔

'ٹھیک ہے ایک ہفتہ کافی ہے آپ کے لیے۔' مجھے اس کے لہجے کی شوخی اچھی نہ لگی۔ لگتا

تھا جیسے مجھ پر ہنس رہا ہو۔

'ہاں ایک ہفتہ کافی ہے' حالات ایسے تھے کہ وہ ایک گھنٹہ بھی کہتا تو بھی میں مان جاتا۔ آپ جنات سے کیا بحث کر سکتے ہیں۔ خیر کرنے والے یہ بھی کرتے ہیں۔ جنات سے بھی کشتے ہیں، الجھتے ہیں، مگر میں نے اپنے اندر وہ حوصلہ نہ پایا۔

'کسی سے مشورہ کر سکتا ہوں؟'

'بالکل مشورے کی آزادی ہے۔ بس نتائج آپ خود ہی تنہا بھگتیں گے۔ دانشمندانہ چناؤ کا پھل آپ تنہا خود ہی کھائیں گے۔ جب کہ حماقت آمیز خواہشوں کی صلیب بھی آپ اکیلے ہی اٹھائیں گے۔ لہٰذا جتنا چاہیں مشورہ کر لیں۔ مشورہ اچھا ہوتا ہے۔ اس سے ذہن کے وہ دریچے روشن ہو جاتے ہیں جو ویسے تاریکی میں ہوں۔ مشورہ سب سے مگر فیصلہ خود اپنا۔'

'مشورہ سب سے مگر فیصلہ اپنا' میں زیرِلب بڑبڑاتا گاڑی میں جا بیٹھا۔ جتنا جلد ممکن ہو یہاں سے دور بھاگ جاؤں۔

'اگلے ہفتے اسی وقت اسی جگہ۔' قسم لے لیجیے، وہ ہنس رہا تھا۔ میری صورتِ حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں ذرا صلح جو قسم کا آدمی ہوں۔ اپنے سے بڑی طاقت کو دیکھتا ہوں تو صلح جوئی اولین حکمتِ عملی ہوتی ہے۔ کوئی کمزور آدمی ہوتا تو مکہ مار کر دانت توڑ دیتا۔ مگر اس کی تپا دینے والی مسکراہٹ کو سعالین کی کڑوی صافی کی طرح پی گیا جیسے سعالین سامنے کھڑے تاثرات دیکھ رہے ہوں۔

میں دراصل دفتر کے کام سے نکلا تھا۔ اب ایک میٹنگ ختم کر کے واپس دفتر کا رخ کیا تھا کہ یہ حادثہ ہو گیا۔ اب جو واپس دفتر کی طرف گاڑی موڑی تو ذہن کے ہر گوشے میں یہی سوال اچھل رہا تھا، کون سی خوشی مانگو گے، کون سی خوشی مانگو گے۔ شہر کا لینڈ اسکیپ اچانک بہت بدلا بدلا اور اپنا اپنا لگنے لگا۔ ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب۔ ذرا دشتِ امکاں کی لامحدودیت تو دیکھیے۔ یہ جو سامنے شیرٹن ہوٹل کھڑا ہے یہ مانگ لوں، ساری زندگی میرا رہے گا۔ شیرٹن کی ملکیت کے ساتھ جو Fringe Benefits مل سکتے ہیں اس نے میرے نقش پا کو دوسرے آسمان پر پہنچا دیا۔ بڑے ہوٹلوں میں عیاشی کے جو قصے سن رکھے تھے، وہ سب نظر کے سامنے پھر گئے۔ ادھیڑ

عمری میں جوانی کی پھریری سی آ گئی۔ گاڑی اگلے چوک پر پہنچی تو اسٹیٹ بینک کی عمارت پر نظر پڑی۔ ذہن نے اچانک قلابازی کھائی۔ اپنی نیچی سوچ اور کم مائیگی کا افسوس ہوا۔ واقعی آدمی کی جتنی بساط اتنی ہی سوچ۔ ارے اسٹیٹ بینک کا سارا مال مانگ لے۔ سارا سونا، سارے نوٹ، سارے بانڈ۔ کتنے ہی شیرٹن ہوٹل خود بندھے آئیں گے۔ مجھے اپنی سابقہ سوچ پر بہت شرمندگی اور ندامت ہوئی۔ اس نئے انکشاف نے مستی و انبساط کی ایک نئی لہر جسم میں دوڑا دی۔ بلکہ ایک اسٹیٹ بینک کیا، اس سے کہوں گا بس مجھے دنیا کا امیر ترین آدمی بنا دے۔ اب میری سوچ تیزی سے امارت کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ مجھے اپنی ذہانت پر فخر ہونے لگا۔ بقیہ ساری زندگی دنیا کا امیر ترین آدمی۔ اچانک اس چھوٹی سی کار میں مجھے اپنے گھٹنے بہت بڑے لگنے لگے۔ لال بتی پر کار رکی تو فقیر نے اپنی انگلیوں سے شیشہ کو کھنکھٹایا۔ میں اکثر اس اپاہج فقیر کو گاڑی میں رکھا چلرو پکڑا دیا کرتا تھا۔ آج وہ مجھے بہت چھوٹا بہت حقیر لگا، اب میرے اس کے درمیان فاصلہ بہت بڑھ گیا تھا۔ اس کی طرف دیکھے بغیر میں نے گاڑی آگے بڑھا دی، ہنہ۔

ایک غم کی صورت میں ملنے والا دوسرا انعام لاشعور کی کسی تاریک گپھا میں جا بیٹھا تھا۔ کیا خوشی انسان کے لیے غم سے زیادہ اہم ہے۔ اب تک میں صرف پہلے انعام کی بابت ہی سوچ رہا تھا۔ ابھی پہلے انعام کا فیصلہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک منحوس خیال آ کودا۔ کیا ہوگا اگر وہ مجھے دنیا کا امیر ترین آدمی بنا دے، لیکن مجھے فالج ہو جائے، پولیو ہوجائے یا میں نابینا ہو جاؤں۔ یا اللہ یہ ہوا ہی کیوں۔ شاید مجھے صحت مانگنی چاہیے۔ ہاں باقی زندگی صحت مند رہوں اور اچانک نکل لوں۔ غبارہ پھولتا رہے اور پھر اچانک ایک سوئی کی نوک لگی اور بوم۔ لیکن اگر پیسے نہ ہوں تو پھر یہ تندرستی کس کام کی۔ تنگ دستی اگر نہ ہو سالک تن درستی ہزار نعمت ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ صحت بھی دے دے اور پیسے بھی۔ لیجیے ایک بار پھر معاملہ الجھ گیا۔ آپ مجھ پر ہنس رہے ہیں۔ اچھا بتایئے آپ کیا مانگتے؟ دیکھا سٹ پٹا گئے۔ خیر اب میں عجیب ادھیڑ بن میں تھا۔ کبھی سوچتا شہرت مانگ لوں، کبھی دولت۔ دنیا کا امیر ترین آدمی۔ آٹوگراف لینے کے لیے لڑکیوں کی قطار لگی ہے۔ سر آٹوگراف، سر آٹوگراف، میں سر کے ایک خفیف اشارے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھ جاتا ہوں۔ شہرت، مگر مشہور تو ہٹلر بھی تھا، ہلاکو بھی، کئی قاتل اور ڈاکو بھی

مشہور ہیں۔ کیا پتہ وجۂ شہرت کیا بنے اور پھر بغیر پیسوں کے دنیا کا مشہور ترین کنگلا۔ کبھی اولاد کا پلّہ بھاری ہو جاتا، کبھی تعلیم کا۔ اسی کشمکش میں دفتر پہنچ گیا۔ دفتر تو آ گیا لیکن کام میں دل نہیں لگا۔ ذہن اسی ایک عمل کی کھوج میں مصروف تھا جو ہمیشہ کی خوشی دے دے۔

'کیا بات ہے یار، دھیان کہیں اور لگا ہے؟' میرے ساتھی کارکن نے پوچھا۔

'نہیں۔ نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں' میں لاٹری کا ایک دھیلہ بھی کسی کے ساتھ شراکت کرنے والا نہیں تھا، بالکل انجان بن گیا۔ پھر ذہن میں کچھ خیال آیا تو اس سے پوچھا۔

'اچھا یہ بتاؤ کوئی تم سے پوچھے، کہ تمھاری ایک خواہش پوری کر دے گا تو تم کیا مانگو گے؟'

'یہ کیسا سوال ہے، کون خواہش پوری کر رہا ہے' اس نے مشکوک انداز میں رازداری سے منہ میرے کان کے نزدیک لا کر پوچھا۔

'ارے نہیں ایسے ہی ایک افسانہ پڑھ رہا تھا۔ اس میں یہ سوال بہت اچھالا جا رہا تھا۔ کمبخت ذہن میں چپک گیا ہے اس وقت سے۔'

'ہنہ بھئی میں تو اولاد مانگوں گا۔ چودہ برس ہو گئے شادی کو ایک چڑیا کا بچہ بھی نہ ہوا۔'

'دولت نہیں مانگو گے، بچہ تو گود بھی لیا جا سکتا ہے۔'

'جب اولادِ نرینہ ہی نہ ہو تو دولت کس کام کی۔ میرے بعد کسی اور کے کام آئے گی۔ پھر گود لیا بچہ تو گود لیا بچہ ہوگا، اپنا خون تو نہیں۔' اس نے ایک آہ بھر کے کہا۔

پھر تو اگلے تین چار روز یہ میرا معمول بن گیا، دوست، رشتہ دار، محلّہ دار، جو بھی ملتا، اس سے یہی سوال؛ آپ کی صرف ایک خواہش پوری ہو سکے تو آپ کیا مانگیں گے۔ جس کے ہاں اولاد نہیں تھی اس نے اولاد کی تمنا کی۔ ایک صاحب کو کینسر کا عارضہ تھا انھوں نے صحت یابی کی خواہش کی، ایک پڑوسی کی اکلوتی بیٹی ۳۹ سال کی ہو چکی تھی اس کے والد کی سب سے بڑی خوشی یہی تھی کہ بچی کا کہیں رشتہ ہو جائے۔ ان متضاد جوابات نے مجھے اور چکرا دیا۔ یا اللہ سب انسان کسی ایک خوشی پر بھی متفق نہیں۔ خوشی بذاتِ خود کوئی تتلی نہیں کہ جسے پکڑ کر جیب بھر لی جائے، خوشی کا انحصار حالات اور ضروریات پر ہوا۔ شاید جو شے آپ کو ایک وقت خوشی دے وہ کسی اور لمحے باعثِ خوشی نہ بنے۔ اسی سوال و جواب کے چکر میں چھ دن گزر گئے۔ ساری رات

کروٹیں بدلتا رہا کل اس سے کیا مانگوں گا۔ اور پھر اس ہڑبونگ میں کسی خوشی کی خواہش کر بھی لوں تو غم کی خواہش کا کیا کروں۔ بیٹھے بٹھائے کیوں جان کو روگ لگا لوں۔ غم تو غم ہے چاہے اولاد کا ہو یا صحت کا۔ دولت کا ہو یا تنہائی کا۔ میں کیوں کر اسے پال سکوں گا۔ آنکھوں دیکھی مکھی کیسے نگل لوں۔ کیا منحوس گھڑی تھی کہ میں اس گلی سے گزرا تھا۔ ساری رات کروٹیں بدلنے میں کالی ہوگئی۔ صبح دم ذہن میں روشنی سی کوندی کہ ابھی اس سے اور وقت مانگوں۔ کیا بہانہ کروں گا، اس سوال کا جواب بھی آسان نہیں تھا۔ ذہن میں کچھ جمع وتفریق کرکے میں نے گلوخلاصی کی ترکیب سوچی اور کروٹ بدل کر سو گیا۔

ایمان کی بات تو یہ ہے کہ مجھے کامل یقین تھا کہ آج اس جگہ کوئی نہیں ہوگا۔ اسی گلی کے نکڑ پر گاڑی کھڑی کرکے پہلے جائزہ لیا کہ کہیں تماش بین تو نہیں جمع کر رکھے۔ لوگوں کو الو دیکھ کر بہت لطف آتا ہے۔ اپنی ذہانت پر ایمان بڑھ جاتا ہے۔ کوئی نظر نہ آیا تو ہمت کرکے گاڑی آگے بڑھائی۔ اسی درخت کے پاس پہنچ کر گاڑی ذرا آہستہ کی تھی کہ وہ پھر یک دم سامنے آ گیا۔ میں خود اپنے جذبات نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ ظاہراً تو یہ کہ وہ آج نہ ملے اور اس جنجال سے جان چھوٹے، مگر اندر کہیں امید کی ایک کرن روشن تھی کہ وہ آ جائے تو اچھا ہے۔ بغیر محنت کے پھل سے کم ہی لوگ پرہیز کرتے ہیں۔ قریب پہنچ کر گاڑی روکی تو وہ اچک کر بونٹ پر بیٹھ گیا۔ آپ کسی کو کچھ بخش رہے ہوں تو آپ کا پلہ خود بخود بھاری ہو جاتا ہے۔ دینے والا بونٹ پر بیٹھ جاتا ہے۔ لامحالہ مجھے گاڑی سے نکل کر باہر آنا پڑا۔ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے مجھے تک رہا ہے۔ دونوں اس انتظار میں کہ دوسرا گفتگو میں پہل کرے۔ گفتگو میں پہل کرنے سے اکثر کمزور پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں۔

’تو جنابِ عالی نے دو خواہشیں چن ہی لیں‘ جن انسان کی چال سے ہار مان گیا۔ ’شاید ہاں، مگر شاید نہیں۔‘

’یہ کس قسم کا جواب ہے۔ بتائیں وہ کیا خواہش ہے جس سے آپ کو بہت ساری خوشی ملے گی، دائمی وہ خوشی آپ کی پوری کردوں۔‘

’بھئی میرے ذہن میں خاکہ سا بن تو رہا ہے، مگر تمھارے سوال مزید تشریح چاہتے ہیں۔‘

میں نے ذرا گھما پھرا کے جواب دیا۔

'کیا مطلب، بہت آسان اور سادہ سی زبان میں سمجھا دیا تھا میں نے' وہ کچھ خفا سا ہو گیا۔

'دیکھو خاص طور پر وہ غم والا مسئلہ بہت ٹیڑھی کھیر ہے۔ غم کیا چیز ہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ میں کسی چیز کا غم لوں ہی ناں۔ جو حاضر ہے اس میں حجت نہ کروں۔ سوکھی ملے تو سوکھی کھاؤں، نہ ملے تو بھوکا رہوں مگر غم نہ کھاؤں، پھر کیا کرو گے میں نے گویا اسے چیلنج کیا۔

'یوں سمجھ لیں کہ کوئی چیز جو آپ کے پاس ہو، آپ کے کام کی ہو یا آپ کو عزیز ہو، وہ اگر آپ سے لے لی جائے، تو آپ کو جو دکھ ہو گا وہ غم ہے۔'

'یہ کیا بات ہوئی۔ میری یہ گاڑی ہے پہلے نہ تھی۔ جب ملی تو خوشی جب چھن گئی تو غم؟'

'صاحب آپ کیا اللہ والے ہو یا دنیا سے عجوبے ہو۔ آپ کا خیال غلط ہے۔ دکھ اور غم تو ضرور ہو گا۔ چھننے والی چیز جتنی زیادہ قیمتی ہو گی اتنا دکھ زیادہ ہو گا۔ اولاد کا غم اسی لیے کہتے ہیں دوسرے سارے غموں پر بھاری ہے۔ لیکن سنا ہے غم کا ظرف سے بھی چولی دامن کا ساتھ ہے، کچھ بڑی چوٹ کھا کر بھی غم نہیں کھاتے اور کسی کو چھوٹی چھوٹی باتوں کا غم کھائے جاتا ہے۔'

'اب دیکھو یہ ہوئی ناں بات۔ یہ تم نے نیا پہلو نکالا ہے کہ جو چیز پاس میں ہے وہ چھن جائے تو اس کا نام غم ہے۔ بات اب میری سمجھ میں آ گئی لیکن اس نہج پر غور کرنے کے لیے ایک ہفتہ اور دے دو۔'

اس نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا 'تو آپ کیا سمجھے تھے غم کوئی تمغہ ہے جو میں آپ کے سینے پر سجا دوں گا کہ آپ زمانے بھر کو دکھاتے پھریں اور ہمدردیاں مول لیں۔ غم تو بہت ذاتی سا احساس ہے خوشی سے بھی زیادہ۔ میرے خیال میں آپ ٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں۔ میں خود اپنی مرضی سے آپ پر ایک خوشی اور ایک غم تھوپ دیتا ہوں۔'

'ارے نہیں' میں ایک دم گھبرا گیا۔ 'اس کی ضرورت نہیں، بس مجھے ایک ہفتے کی مہلت اور دے دو، پھر اس کے بعد جیسا چاہو سلوک کر لینا۔'

'بس ایک ہفتہ اور یہ آخری مہلت ہو گی۔ مزید بہانہ بازی نہیں ہو گی۔' جن نے مجھے

وارننگ دی۔ میں الٹے قدموں سے گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ منہ اٹھا کر دیکھا تو وہ چھلاوہ پھر غائب ہو چکا تھا۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ دل ہی دل میں اپنی ذہانت پر بہت خوش تھا۔ پورا ایک ہفتہ مزید مل گیا تھا سوچنے کے لیے۔ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ تھامے، شاید میرے ہونٹوں پر کوئی گیت بھی مچل رہا تھا۔ شاید Bill Gates کو بھی گاڑی چلاتے ہوئے ایسا ہی محسوس ہوتا ہے، جو چاہے خرید لے۔ کیسی عجیب سی حسیت تھی۔ مگر وہ تو صرف دولت سے حاصل ہونے والی اشیا خرید سکتا تھا۔ میری پرواز تو اس سے بھی بہت آگے چلی گئی تھی۔ اگلے ہفتے اسی جگہ، اسی وقت میں جو چاہے حاصل کر لوں گا۔ یہ احساس ہی مجھے مخمور کیے دے رہا تھا۔ ایسے میں وہ ٹرک بھی نظر نہ آیا جو بالکل سر پر آ چکا تھا۔ اب جو ٹرک ڈرائیور نے زور سے ہارن بجایا تو گھبراہٹ میں گاڑی تیز کرنے کے بجائے بریک دب گیا۔ گاڑی وہیں جیسے وسط سڑک پر جیسے جم گئی۔ بھاری بھرکم ٹرک اپنی رو میں رک نہ سکا اور میری گاڑی کو دور تک دھکیلتا چلا گیا۔ دھکا لگنے تک تو مجھے یاد ہے، پھر اس کے بعد آنکھ ہسپتال میں کھلی۔

ایمرجنسی میں آنکھ کھلنا خود کسی قیامت سے کیا کم ہے۔ چاروں طرف ایک افراتفری کا عالم ہے۔ ڈاکٹر اور نرسیں کم تشویشناک سے زیادہ تشویشناک مریض کی طرف لپک رہے ہیں۔ سرہانے ایک کھمبے سے ڈرپ لٹک رہی ہے۔ میرے داہنے بازو اور ماتھے پر پٹی بندھی تھی۔ سینے پر قسم قسم کے تار چسپاں تھے۔ چاہا کہ ذرا ہل کر بستر پر بہتر پوزیشن لے لوں، مگر داہنا پاؤں ہلنے سے انکاری تھا۔ ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

'ارے گیارہ نمبر کو ہوش آ گیا ہے۔' کسی نرس کی کرخت آواز کان میں گونجی۔ نرس کی آواز اس وقت زیادہ حسین لگتی ہے جب آپ خود بیمار نہ ہوں بلکہ کسی کے تیماردار ہوں۔ چند لمحوں میں ایک ڈاکٹر اور نرس میرے بستر کے پاس موجود تھے۔

'خدا کا شکر کریں جان بچ گئی۔ میں تو ڈر گیا تھا کہ آپ گئے ہاتھوں سے، بہت خطرناک ایکسیڈنٹ تھا' ڈاکٹر نے میری نبض پکڑتے ہوئے کہا۔

'ڈاکٹر صاحب میری داہنی ٹانگ نہیں اٹھ رہی؟'

'ہاں بھئی یہ ایک مسئلہ ہے۔ ایک تو حادثے میں دھکا لگنے سے مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں

آپ کی بینائی نہ چلی جائے، یہ خطرہ کم ہو گیا ہے مگر ابھی باقی ہے۔ Concussion کی وجہ سے اس کا خطرہ ابھی باقی ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ آپ کی ٹانگ کا زخم ذرا مشکل نوعیت کا ہے، ہوسکتا ہے ٹانگ کاٹنی پڑے ورنہ خطرہ ہے زخم پورے جسم میں نہ پھیل جائے۔'

'نہیں ڈاکٹر صاحب میں اپاہج بن کر ساری زندگی کیسے رہ سکوں گا۔'

'اس کے سوا شاید کوئی چارہ نہ ہو۔ ہم آرتھوپیڈک ڈاکٹر کا انتظار کر رہے ہیں ان کا فیصلہ آخری ہوگا۔'

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اچانک ذہن میں اس جن کا خیال آیا۔ وہ ہوتا تو میں اپنی ٹانگ بچا لیتا۔ کیا واقعی اس وقت ٹانگ دنیا کی تمام دولت سے زیادہ قیمتی ہے۔ میں اس حالت میں بھی اس ادھیڑ بن سے باہر نہ نکل سکا۔ مگر وہ کمبخت تو اب ایک ہفتے کے بعد ملے گا۔ خوشی اپنے وقت سے آتی ہے ہمارا کیلنڈر نہیں دیکھتی۔ کیا ڈاکٹر سے کہوں ایک ہفتہ انتظار کر لے۔ نرس نے آ کر درد کا انجکشن لگایا تو میں حواس کی وادی سے نکل آیا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو ایک نیا، ذرا عمر رسیدہ سا ڈاکٹر میری داہنی ٹانگ سے کھیل رہا تھا۔

'معاف کرنا میں آپ کو بیدار کرنا نہیں چاہ رہا تھا، مگر معائنہ کرنا بھی ضروری تھا۔' نئے ڈاکٹر نے میری ٹانگ کو گھٹنے پر موڑ کر کولہے کے جوڑ سے گھمایا۔

'ٹانگ وغیرہ کاٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چھوٹا سا آپریشن ہوگا اور دس روز کی اینٹی بائیوٹک۔ دو دن ہسپتال میں اور پھر تقریباً تین چار دن مزید آرام گھر پر۔ بڑی خیریت ہوئی۔ کیا بہت پرانی گاڑی تھی، پولیس والا بتا رہا تھا کہ بیچ سڑک پر رک گئی تھی؟'

مجھے لگا جیسے ڈاکٹر بھی میرے ذہن میں اتر کر میرے راز جان چکا ہے اور اب ہنسی اڑا رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، ڈاکٹر آگے بڑھ چکا تھا۔ اور ہُوا بھی یہی۔ بہت چھوٹا سا ایک آپریشن ہوا پھر ڈسچارج ہو کر گھر۔ بہت خیریت ہوئی کہ وہ خواہش ٹانگ بچانے میں ضائع نہیں ہوگئی۔ ٹانگ کو تو بچ ہی جانا تھا۔ ان دو تین دنوں میں مجھے گھر پر خوب سوچنے کا موقع مل گیا۔ اور اب میں مطمئن تھا کہ میرا درمقصود کیا ہے۔ اس حادثے نے فیصلے کو آسان بنا دیا تھا۔

پانچویں دن میں نے بے ساکھی پھینک کر خود چلنا شروع کر دیا۔ چھٹے دن معمولاتِ زندگی میں 'جیسے تھے' کی اجازت مل گئی۔ یوں ساتویں دن میں پھر ڈرائیونگ کے قابل تھا۔ ذہن میں کیوں کہ فیصلہ ہو چکا تھا، میں چھٹی رات خوب جم کر سویا۔ ساتویں دن ہم ہماتے گاڑی نکالی اور جگہ مقررہ کی جانب چل پڑا۔ امید کے مطابق جن صاحب پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھے۔

'ٹانگ کیسی ہے؟' جن نے رسمی علیک سلیک کے بعد دریافت کیا۔

'تمھیں کیا پتہ' میں اپنا تحیر نہ چھپا سکا۔

'جن بھی مانتے ہو پھر یہ سوال بھی کہ مجھے کیسے پتہ چلا۔' جن مسکرایا۔ 'تمھارا المیہ یہی ہے کہ ان دیکھی طاقت پر ایمان ہے لیکن اس کی رسائی سے غافل ہو۔'

'کیا مطلب؟'

'چھوڑو ان فروعی باتوں کو بات الجھ جائے گی۔ یہ بتاؤ کہ دو خواہشوں پر قانع ہو سکے یا نہیں۔ اب مزید مہلت نہیں ملے گا۔'

'ہاں بھئی بہت سوچ سمجھ کر میں صحیح فیصلے پر پہنچ گیا ہوں۔ میرے خیال میں اس سے میرا مستقبل ہمیشہ کے لیے تابناک و محفوظ ہو جائے گا۔'

'بہت اچھی بات ہے۔' جن نے بچوں کی طرح تالی بجا کر خوشی کا اظہار کیا۔ 'بتاؤ اور حیران کر دو۔ وہ کون سی خواہش ہے جسے تم نے دوسری خوشیوں پر مقدم کیا؟'

'بتا دوں، بتا دوں' میں بلا وجہ ڈرامائی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ جن کی بے چینی دیکھ کر غالباً لاشعوری طور پر اس سے انتقام لے رہا تھا۔

'میری پہلی خواہش یہ ہے کہ ہر رات ایک نیا خواب دیکھ سکوں' جن کی بڑی بڑی آنکھیں دیدوں سے باہر آنے کو تیار تھیں۔ 'کیا ٹانگ کے ساتھ دماغ پر بھی ضرب آئی تھی؟'

'یہی میری خواہش ہے اب پورا کرو۔'

'کسی سے مشورہ کر لیتے' جن اب بھی تذبذب میں تھا۔

'بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ بس ہر رات ایک نیا خواب دیکھتا ہوں تو باقی خوشیاں خود ہی مل جائیں گی۔ صحت، دولت، شہرت، عظمت سب خواب ہی کے تابع ہیں۔ خواب ہی

آگے بڑھنے کی کنجی ہے۔ بس خواب دکھا دو، نئے نئے خواب۔'

'میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا' جن نے بے چارگی سے کہا۔

'تم نے کبھی خواب نہیں دیکھے' میں نے ترحم آمیز لہجے میں پوچھا۔

'جنات سویا نہیں کرتے۔ مجھے نہیں معلوم خواب کیا ہے۔ تذکرہ ضرور سنا ہے اپنے بزرگوں سے۔'

'بس جن اب تم اس میں مزید سر نہ کھپاؤ اور میری خواہش پوری کر دو۔'

'بھاڑ میں گیا یہ میرا نورانی پن، اس سے تو بھلا تھا میں بھی خاکی ہوتا، کیا واقعی خواب بہت مزے کے ہوتے ہیں؟'

'بہت مزے کے، بہت سہانے۔' میں اسے کب معاف کرنے والا تھا بھلا۔'اور جہاں تک نوری یا خاکی کا تعلق ہے تو کوئی تو وجہ ہوگی کہ ایک کو دوسرے کے آگے جھکا دیا۔'

'کس کو کس سے جھکا دیا' وہ بہت الجھ رہا تھا۔

'رہنے دو، تاریخ کے جو باب تاریک ہوتے ہیں انھیں یا تو ہم بند کر دیتے ہیں یا ان میں Spin پیدا کر دیتے ہیں۔ تم تو نرے بدھو ہو، Spin سے بھی واقف نہ ہوگے۔ فاتح ہوتے تو تاریخ اپنی مرضی سے قلم بند کر لیتے۔ ضرور تمھارے بزرگوں نے بھی تمھیں اندھیرے میں رکھا ہے۔ رہنے دو ان فروعی باتوں کو مزید الجھ جاؤ گے۔' میں نے اس کا جملہ اسی پر الٹ کر انتقام لے لیا۔'بس اب بہانے نہ بناؤ جلدی میری خواہش پوری کرو۔'

'سمجھو ہوگئی پوری۔' جن نے تالی بجائی، منہ سے کچھ اناپ شناپ پڑھا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے میرے سر کے اوپر ایک ہالہ سا بنا دیا۔

'اب دوسری خواہش کیا ہے۔ وہ کون سا غم ہے جو ساری زندگی کے لیے لینا پسند کرو گے۔' جن کے لہجے میں شکست سی تھی۔

'غم کا مطلب ہے کوئی ایسی چیز جو میرے پاس ہے، اور مجھ سے لے لی جائے، درست؟' میں نے دوبارہ وضاحت ضروری سمجھی۔

'ہاں بالکل درست، اب جلدی بتاؤ میرا وقت خراب نہ کرو۔'

'تو میری دوسری خواہش یہ ہے کہ مجھ سے میرا احساس چھین لو' میں مسکرایا، میرے لہجے میں پریشانی کی جگہ طنزیہ بے تابی تھی۔ 'مجھ کو ہمیشہ کے لیے غم ناک کردو کہ مجھ سے میرا احساس چھن گیا' میں بہت فلمی انداز میں ڈائیلاگ بولا۔

جن نے اب مجھے غور سے دیکھا کہ کھیل کیا ہے۔

'تمھارا احساس چھین لوں' اس سے کیا ہوگا۔

'یہ سوچنا تمھارا دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ احساس کے چھن جانے کا غم مجھے کھا جائے گا۔' اپنی غمگین اداکاری پر مجھے خود رشک آرہا تھا۔

'میں ہر دفعہ سوچتا ہوں کہ اب انسان کو سمجھ گیا ہوں، مگر پھر بھی وہ مجھے ہر بار حیران کر دیتا ہے۔' جن بہت شکست خوردہ دکھائی دے رہا تھا۔ 'مجھے سمجھا تو دو کہ یہ احساس کے کھونے پر ہی کیوں زور ہے۔'

'ارے میاں نہ یہ احساس رہے گا نہ یہ سود و زیاں میری روح پر چرکے لگائے گا۔ یوں سمجھ لو کہ احساس کھو کر میں ایک موٹی، چکنی کھال خرید رہا ہوں۔'

'I give up' کہہ کر جن نے دوبارہ کچھ اناپ شناپ پڑھا اور اس دفعہ مجھے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ اس کی گرفت سے آزاد ہوا تو لگا میرا وزن آدھا رہ گیا ہے۔ بہت ہلکا ہر غمِ دوراں سے مبرا۔

'جایئے، دونوں خواہشیں پوری کردی ہیں۔ قسم اس رب العزت کی جو میرا اور آپ کا دونوں کا بنانے والا ہے، ایسی بے ڈھنگی خواہشات نہ پہلے سنی تھیں، نہ آئندہ سننے کی تمنا ہے۔' یہ کہہ کر جن نے تالی بجائی اور اس کی جگہ صرف دھواں میری آنکھوں کے سامنے ناچ رہا تھا۔

میں بہت خوش خوش اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔ اب میں اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اپنی فراست پہ نازاں و مغرور۔ ابھی گاڑی نے ایک میل ہی طے کیا تھا کہ لگا جیسے اچانک سورج غروب ہوگیا ہو۔ دونوں آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ تو خیریت ہوئی گاڑی کی رفتار ہلکی تھی اور سڑک سنسان، میں نے اندازے سے گاڑی ایک طرف روک دی۔ اب میرے چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ کسی نے میرا حال دیکھ کر ایمبولنس بلا لی اور دس

منٹ میں پھر اسی ہسپتال کی ایمرجنسی میں تھا جس سے چند دن پہلے رخصت ہوا تھا۔

'آہ' وہ ایمرجنسی روم کا ڈاکٹر مجھے فوراً پہچان گیا۔

'وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا، مجھے امید تھی کہ یہ مشکل آپ پر نہیں آئے گی'، میری روداد سن کر ڈاکٹر نے افسوس سے کہا۔ 'یاد ہے میں نے کہا تھا کبھی کبھی concussion سے بینائی دیر سے بھی چلی جاتی ہے۔'

نرس نے ترحم آمیز انداز میں میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وا رے قدرت، تیرے انداز۔ کیا ضروری تھا فوراً مجھے میرے مقام پر پہنچانا۔

'ڈاکٹر کیا نابینا خواب دیکھ سکتے ہیں' میں نے بے چارگی سے پوچھا۔

اپنی تمام پیشہ ورانہ سنجیدگی کے باوجود نرس کی ہنسی چھوٹ گئی اور کمرہ اس کے دبے دبے قہقہہ سے گونج اٹھا۔

صبح کا بھولا

میں نے جلدی جلدی آخری گاہک کو فارغ کیا اور انور کو دکان کا خیال رکھنے کا کہہ کر باہر لپکا۔ ذرا دیر اور ہو جاتی تو نماز قضا ہو جاتی۔ ویسے ہی کون سی پانچ وقت کی نماز ہو پاتی تھی۔ فجر کے وقت اٹھنے کے لیے جس یقین محکم اور ایمان کامل کی ضرورت ہے اس سے محروم ہوں۔ عشا کی بھی پڑھی تو پڑھی ورنہ اگر فتح نیند کی ہوئی تب اس کی رحمت پر تکیہ بڑھ جاتا ہے۔ مسجد کے صحن میں ہی وضو کیا۔ کھلے عام وضو کے اپنے فوائد ہیں، جس سے صرف وہ ہی لوگ واقف ہیں جو نیکی دکھا کر کرتے ہیں۔ وضو کر کے جماعت میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہوگئی۔ صفیں بندھ چکی تھیں اور نمازی نیت کر چکے تھے۔ اللہ اکبر، قبلہ مولانا صاحب جس خضوع وخشوع سے نماز پڑھاتے ہیں اس سے میرا ایمان تازہ ہو گیا۔ نماز کے بعد لپک کر مولوی صاحب سے مصافحہ کا شرف حاصل کیا، دل میں ایک کھٹک سی تھی کہ آج کچھ دیر ہوگئی ہے نماز ہوئی بھی کہ نہیں؟ مولوی صاحب سے پوچھا تو انھوں نے گلے لگا کر تسلی دی، نماز بالکل ہوئی ہے، اللہ قبول کرنے والا ہے۔ جوش ایمان سے مغلوب ہو کر مسجد سے باہر نکلتے ہوئے باہر صندوقچی میں پورے سو روپے بھی ڈال دیے۔ بس اس بات کا خیال رکھا تھا کہ مولوی صاحب اس کار خیر سے بے خبر نہ رہیں۔ نماز پڑھ کر تیز قدموں سے واپس لوٹا تو دکان میں تین گاہک موجود ہیں۔

میری یہ فارمیسی علاقے کی بڑی اور مصروف فارمیسیوں میں سے ہے۔ مقامی بنی دوائیں خاص طور پر سستے داموں دستیاب ہیں۔ غیر ملکی دوائیں جو عام مارکیٹ میں دستیاب نہ ہوں وہ بھی چند دنوں میں منگوا دینے کا انتظام ہے۔ مقامی صارفین میں بہت عزت ہے۔ پانچ وقتی نماز اور ہلکی سی داڑھی نے عزت کی وہ ڈگری عطا کی ہے جو کسی اور طرح ملنا ممکن نہیں ہے۔ لوگ اسی بھروسے پر جوق در جوق میری دکان کا رخ کرتے ہیں۔ انور پہلے ہی ایک گاہک کو نبٹا رہا تھا میں نے دوسرے گاہک سے دوا کا پرچہ لے کر اسے بھرنا شروع کر دیا۔ شام تک آج بھی بہت مصروفیت رہی۔ اب وہ عمر نہیں رہی۔ شام ہونے تک میں تھک جاتا ہوں۔ پہلے اکیلا سب کام کر لیتا تھا اب انور کے ہاتھ بٹانے کے باوجود کام پورا نہیں ہوتا۔ شام آٹھ بجے میں نے دکان کا شٹر اندر سے گرا لیا تاکہ آخری ایک گھنٹہ چیزیں سمیٹ لیں۔ انور دکان کی صفائی میں لگ گیا، میں دکان کے پچھلے حصے میں کل کی دوائیاں بنا رہا ہوں۔ آج خوب بکری ہوئی ہے، نور جہاں میری کمزوری ہے، اسی کا ایک گیت ہونٹوں پر مچل رہا ہے۔ اوپر کے شیلف سے دو پاؤڈر کی بوتلیں ایک ہاون دستے میں ملا کر اس کے ساتھ سرخ رنگ کوٹ لیا۔ یہ سرخ شربت کارمینا مکسچر کی شکل کا ہے اور بہت مقبول ہے۔ روزانہ بلا مغالبہ درجنوں بوتلیں نکل جاتی ہیں۔ دہ گیلن کی بوتل میں یہ مکسچر بنا کر بھرا، پھر اس کے بعد دوسری خالی بوتلوں پر توجہ دی۔ شروع میں انور کو میں دکان کے پچھلے حصے سے دور رکھتا تھا۔ بلا ضرورت گواہ پیدا کرنے کے کوئی فوائد ہوں تو مجھے بھی بتایئے۔ مگر بھئی بڑا تیز لڑکا ہے بھی، دو چار دن میں ہی معاملہ بھانپ گیا۔ بہت قسما قسمی، دھمکیوں اور قرآن پر حلف اٹھوا کر میں نے اسے شامل کیا تھا۔ احتیاط کرنی چاہیے کیا پتہ خفیہ کا ہی کوئی بندہ ہو۔

اب دکان بند کر کے میں گھر کی جانب چل دیا ہوں۔ گو گھر میں میرے پاس سوزوکی کار موجود ہے مگر دکان اپنی موٹر سائیکل پر آتا ہوں۔ بلا ضرورت پیسے کی نمائش کا میں بالکل قائل نہیں۔ پھر میرے کاروبار میں یہ زہر قاتل ثابت ہوسکتا ہے۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے میں نے آگے بڑھائی ہے تو حبس کا زور ٹوٹا، مزہ آ گیا۔ اس گرمی میں ذرا ہوا لگی تو میں نے سامنے سے قمیض کے بٹن کھول لیے ہیں۔ اول تو پشیمانی کا کوئی عرق جبیں پر ہے ہی نہیں، ہوتا بھی تو

منافع کی ہوا سے سوکھ جاتا ہے۔ لیجیے گھر آ گیا ہے۔ میں موٹر سائیکل کھڑی کر کے گھر میں گھسا ہوں تو سارے دن کی تھکن دور ہوگئی۔ سامنے ہی میری چہیتی بیوی کھانا لگانا شروع کر چکی تھی۔ پہلے تو میں بہت چیں بہ جبیں ہوا تھا جب میری اماں نے میری عمر سے گیارہ سال چھوٹی شریک حیات تجویز کی تھی، مگر اب بڑھتی عمر کے ساتھ میں اس کی عقلمندی سراہتا ہوں۔ دل میں امنگیں جوان رہتی ہیں۔ نیک بخت مجھے لاشعوری طور پر مجبور کرتی ہے کہ اپنے اوپر توجہ دوں۔ پہلے تو داڑھی پر بہت معترض تھی مگر شکر ہے اسے خود ہی اس کے فوائد کا ادراک ہوگیا۔ خوب جم کر سویا، بھوکا تھوڑے ہی تھا جو نیند نہ آتی!

آج کا دن بھی روز جیسا ہی دن ہے۔ میں صبح دکان تقریباً دس بجے کھولتا ہوں۔ بیوی اور جوان ہوتی تو شاید دکان اور دیر میں کھلتی۔ غسل خانہ ہے اور پھر وہی نور جہاں کا گیت۔ اپنی نوک پلک درست کر کے اب پھر موٹر سائیکل پر سوار وہی دکان کا سفر۔ سفر کے اختتام پر انعام کا امکان ہو تو سفر کھلتا نہیں۔ لوگ تو ساری عمر اسی امید پر گزارتے ہیں، میں تو فقط اپنی دکان تک کا مسافر ہوں۔ میں نے یہ دکان شہر کے ایک گنجان علاقے میں کھولی ہے۔ غریب اور گنجان علاقوں میں مریضوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔ کم پڑھے لکھے اور جاہل لوگ ذرا سوال جواب بھی کم کرتے ہیں۔ نامعلوم اس کی وجہ ان کا نیکی اور سچائی پر اندھا یقین ہے یا داڑھی پر اندھا اعتماد، میرا کاروبار خوب چمک رہا ہے۔ دکان میں اس وقت بھی کئی گاہک موجود ہیں۔ یہ سب تمھارا کرم ہے آقا۔

تقریباً دو بجے ذرا رش کم ہوا تو انور نے شٹر آدھا گرا لیا کہ ہم دونوں کھانا کھا سکیں۔ دکان کے وسط میں ہی اخبار کا ٹکڑا بچھا کر کھانا لگ گیا۔ شروع میں صرف میرا کھانا ہی گھر سے آتا تھا، مگر کمبخت جب سے شریک راز ہوا ہے، کھانا بھی بانٹنا پڑتا ہے، خیر یہ برا سودا نہیں ہے۔ میں کھانے کے ساتھ ساتھ اخبار میں چھپی خبریں بھی پڑھ رہا ہوں۔ میانوالی میں زمیندار کے کارندوں نے ایک ہاری کی بیوی کی عزت لوٹ لی۔ میں بلند آواز سے خبریں انور کو بھی سنا رہا ہوں۔ بی اے پاس انور، اگر اخبار کا رخ اس کی جانب ہو تو وہ پڑھ کر سناتا ہے، اس وقت کیوں کہ میری سمت ہے اس لیے یہ فریضہ میں نبھا رہا ہوں۔ کہنے کو تو بی اے پاس ہے مگر گفتگو ایسی

فلسفیانہ کہ اکثر مجھے لگام ڈالنی پڑتی ہے۔ ہمارا معاشرہ صرف ان فلسفیوں کو برداشت کرتا ہے جو روایت کے پابند رہیں ورنہ ہم نے سقراط اور گلیلو کی سزائیں اپنے برداشت کے پینل کوڈ میں سنہری الفاظ میں لکھ رکھی ہیں، بس ایک فتوے کی مار ہیں یہ نام نہاد سوچ کار۔ پولیس نے مجرموں کو گرفتار کر کے رہا کر دیا کیوں کہ اس واردات کے چار گواہ نہ مل سکے۔ امکان ہے کہ مسمات پر زنا کا مقدمہ قائم ہو جائے گا۔

ان کی تو۔۔۔انور نے بلند آواز سے گالی دی۔

آپ کو کیا تکلیف ہے؟ میں نے ہنس کر پوچھا۔

کیا مطلب ہے، اس سے تو بہتر ہے کہ وہ اس واردات کی رپورٹ ہی نہ درج کراتی، کم از کم زنا کے الزام سے تو بچے گی۔

او میاں، بھولے شاہ، نواں اے کیا سوچیے؟

نہیں سر جی. یہ بات نہیں ہضم ہوتی۔

انور انگریزی کا ایک مشہور فقرہ ہے، سناؤں؟

جی؟

"Look who is talking"

اتنے میں باہر سے کسی نے شٹر دھڑ دھڑایا تو میں جا کر کھول رہا ہوں۔

اخاہ، مولوی صاحب، زہے نصیب، آیئے۔ انور مولوی صاحب کے لیے کرسی لے آؤ۔

کہیے کیا خدمت کروں۔ میرے پوچھنے پر مسجد کے مولوی صاحب نے جیب سے پرچہ نکال دیا۔

یہ دوا ہو گی آپ کے پاس۔

بالکل مولوی صاحب ہے، بالکل ہے۔ اوئے انور مولوی صاحب کے لیے ٹھنڈا منگواؤ ذرا۔

ارے نہیں صاحب اس تکلف کو رہنے دیجیے، بس یہ دوا نکلوا دیں۔

بالکل مولوی صاحب، میں دوا نکال رہا ہوں کہ انور قریب کی دکان سے کوکا کولا کی بوتل لے آیا۔

مولوی صاحب ایک بات پوچھوں؟ انور نے سوال کیا۔

ہاں بیٹا ضرور پوچھو۔ مولوی صاحب آنے والے خطرے سے بے خبر تھے

انور ملعون کی حرکت دیکھیے، اخبار کا وہ ٹکڑا جو ابھی ہم پڑھ رہے تھے اٹھا کر مولوی صاحب کو تھما دیا۔

مولانا صاحب یہ بات مجھے بہت کھٹک رہی ہے، یہ دیکھیے اب عورت چار گواہ کہاں سے لائے؟ چار آدمیوں کے سامنے تو یہ فعل ہونے سے رہا۔

بہت نا ہنجار ہے بھئی یہ آپ کا ملازم۔ میاں تمھارے اندر شیطان بول رہا ہے۔ تم مسجد میں بھی نہیں آتے۔ کچھ اپنے مالک سے ہی سیکھ لو۔

مولوی صاحب ان سے جو سیکھ رہا ہوں وہ تو کسی کتاب میں نہیں ملے گا۔

انور کیا بکواس ہے یہ، دماغ خراب ہو گیا ہے تمھارا۔ بند کرو یہ بکواس اور جا کر دواؤں کے شیلف ٹھیک کرو۔

اس سے پہلے کہ وہ اور کوئی اول فول بکنا شروع کر دے، میں نے اسے ڈانٹا۔

مولوی صاحب سے بہت معذرت کر کے انھیں رخصت کیا۔ اس کے بعد ایسا تانتا بندھا کہ انور سے بات ہی نہ ہو سکی۔ وہی تقریباً سات بجے کے بعد فرصت ملی تو میں نے اس کو آڑے ہاتھوں لیا۔

یہ مولوی صاحب سے کیا بکواس کر رہے تھے؟

کوئی غلط بات کی تھی، آپ اپنے ایمان سے بتائیں، آپ کے پاس کوئی جواب ہے اس بات کا۔

ابے تو تو نے ٹھیکا لے رکھا ہے سماج سدھار کا۔

لیکن سر جی کہیں تو بات شروع ہو گی، کوئی تو ڈائیلاگ کا آغاز کرے گا؟

کیسا ڈائیلاگ، یہ لوگ تجھے چوراہے پر ماریں گے۔

تو اس اجتماعی خوف سے کب تک یہ ظلم ہوتا رہے گا۔

ابے کوئی تقریر یاد کر کے آ گیا ہے کیا، گھاس کھا گیا ہے، اپنے ساتھ مجھے بھی مروائے

گا۔ کیا لیڈری کا شوق ہو گیا ہے؟

لیڈر کے انتظار میں کب تک بیٹھے رہیں گے؟

کچھ تو خوف خدا کریں سر جی، مذہب کو اتنا گنجلک بنا کر رکھ دیا ہے۔ جو سرا پکڑو الجھتا ہی چلا جاتا ہے۔ کوئی وسوسہ کوئی سوال دل میں اٹھے تو مارے خوف کے پوچھ نہیں سکتے۔ لگتا ہے سارا شہر ایک اجتماعی نیند سو رہا ہے۔ اس میں کسے شک کہ یہ الہامی کلمات ہیں مگر کہیں ان کی تعبیر میں ہم سے کوتاہی تو نہیں ہو رہی۔ کہیں ایسا تو نہیں بلا سوچے سمجھے کی تقلید میں ہم زیادتی کے مرتکب ہو رہے ہوں، اوپر جا کر الٹی آنتیں گلے پڑ جائیں۔ سر جی وہاں oops یا سوری کا لمحہ نہیں ہوگا۔ سب جانوروں کے مقابلے میں عقل دی ہے تو کوئی تو وجہ ہوگی۔ ویسے تو ہر چیز میں فضول خرچی ہے، عقل کے استعمال میں اس قدر کنجوسی اور کفایت شعاری، اللہ کی پناہ۔ حالانکہ یہ تو عمرو کی زنبیل ہے جتنی خرچ کرواتنی بڑھتی ہے۔

انور منحوس چپ ہو جا، مجھے بھی مروائے گا، میں نے گھبرا کے دائیں، بائیں دیکھا اور لپک کر پورا شٹر گرا دیا۔ مگر انور کی تو لگتا ہے دم پر پیر رکھ دیا تھا۔

چودہ سو سال پہلے تو لوگوں نے اپنی معاشرت، اپنی عقل، اپنی دنیا کے حساب سے اس کے اشاروں، کنایوں اور علامات کو سمجھا ہوگا۔ ہم کیوں مصر ہیں کہ وہی شرح درست ہے۔ کیا غلام رکھنا اب بھی جائز ہے، کیا کنیزوں سے اب بھی رجوع کرنا چاہیے۔ کیا چار شادیوں کی اب بھی ضرورت ہے۔ بجائے اس کے کہ ان سوالات پر بغلیں جھانکیں، وہاں صرف پسینے کی بدبو پا کر غصے سے لال پیلے ہو جائیں، فتووں کے پیچھے جا چھپیں۔ بہتر نہیں کہ اس پر کھل کر غور و فکر کریں۔ تصویر کشی، موسیقی ان چیزوں پر تو واضح احکامات ہیں بھی نہیں، مشرحین نے اپنے زمانے کی ضروریات اور قابلیت کے اعتبار سے تشریح کر ڈالی۔ سر جی میرے ذہن میں یہ خیالات بہت ہنگامہ اٹھائے رکھتے ہیں، میں پاگل ہو جاؤں گا، کیا ہمارے اجتماعی پاگل پن کی یہی وجہ ہے؟ مولانا سے پوچھو تو کہتے ہیں یہ تمھارے اندر کا شیطان ہے، جھڑ والو، پھکوالو۔ زیادہ بحث کرو تو انجام بہت متشددانہ ہو سکتا ہے۔ اس سارے انحطاط کی وجہ یہ تو نہیں کہ ہم بات کرنے، مباحثہ کرنے سے ڈرنے لگے ہیں، بات کرنے سے وہی ڈرتا ہے جسے اپنی بات کی

کمزوری کا ادراک ہو۔ یہ سارا ڈرامہ تو پاپائے روم بھی چار سو سال پہلے رچا چکے ہیں، ہم دوسروں کی تاریخ سے ہی سبق سیکھ لیں۔

انور تو کیا سوشیالوجی میں پی ایچ ڈی ہے؟ میں نے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے مزاح کی ناکام سی کوشش کی۔

نہیں، احساس سوچ اور ادراک میں پی ایچ ڈی ہوں۔ اللہ نے عقل کی نعمت سے نوازا ہے اسے برت رہا ہوں۔ کشش ثقل کی تھیوری مانتے ہیں، Relativity کی تھیوری تسلیم ہے، جہاں Conflict نہیں ہے، وہاں چپ چاپ حقیقت مان لیں گے، جہاں بات الجھ جائے، وہاں غصے سے نیلے پیلے۔ Head تو جیت میری، Tail تو تم ہار گئے۔

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

مجھے تجھ سے خوف آرہا ہے انور، یہ ٹی وی کے ڈرامے زیادہ مت دیکھا کر۔ اور یہ جو ہم کام کر رہے ہیں، مصلح الدین یہ کیا نیکی کا کام ہے؟

میں کب کہہ رہا ہوں سر جی، لیکن پتہ ہے ناں کہ غلط کام ہے پکڑے گئے تو سیدھے اندر، رات کو دن تو نہیں کہہ رہے۔

انور بس ایک ہی شعر پڑھوں گا پھر اس کے بعد یہ موضوع بند، میں نے اب ذرا سختی سے کہا:

خوف آتا ہے تیری باتوں سے
ہم نے کٹتے ہوئے سر دیکھے ہیں

اچھا بقراط بس کر اب، بہت ہو گئی، دکان بند کر۔

مولوی صاحب اس کے بعد ہماری دکان میں نہیں آئے۔ انور کی زبانی تنبیہ کر کے میں نے دکان میں تختی بھی لگا دی کہ سیاسی اور مذہبی بحث سے پرہیز کیا جائے۔ پیالی میں اٹھے طوفان کی مانند معاملہ پھر اپنی ڈگر پر آ گیا۔ وہی صبح شام۔ دوا ہی ہم ایسی دیتے کہ مریض مستقل ہمارا گاہک بنا رہے۔ نہ جانے کیوں ہم اپنے اطراف سے سبق نہیں سیکھتے۔ ہر برائی اپنے انجام

سے واقف ہے، مگر ہر عاصی اس خوش فہمی میں مبتلا کہ میرا انجام یہ نہیں ہوگا۔ میں اُن، ان دیکھے ہاتھوں سے زیادہ طاقتور ہوں جو کسی بھی وقت کشتی الٹ سکتے ہیں۔ ہماری کشتی بھی ایسے الٹی کہ چھاپہ پڑا، گرفتاری ضمانت رہائی سب مرحلوں سے گزرے۔ کچھ دن دکان بند رہی، پھر نئے نام سے کھل گئی۔ اس سے یہ ضرور ہوا کہ میں نے اور انور نے عہد کیا کہ کم کھائیں گے مگر یہ شرمناک کام دوبارہ نہیں کریں گے۔ بات ہے تو افسانوی، مگر ایمان داری سے کام کرنے کے باوجود ہم اپنا منافع دوبارہ پہلے والی سطح پر لے آئے، اور زیادہ محنت اور زیادہ فروخت کے ذریعہ۔

آج پھر رش بہت ہے، مریض نمٹاتے، نمٹاتے بھی دیر ہوگئی۔ بھاگم بھاگ مسجد پہنچا، تو جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، نیت باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ جلدی میں یہ ہوش بھی نہیں رہا کہ بے وضو ہوں۔ نماز ختم ہوئی تو خیال آیا وضو تو کیا ہی نہیں تھا۔ شرمندہ نظر جھکائے مولوی صاحب کے پاس پہنچا تو انھوں نے تصدیق کر دی کہ نماز نہیں ہوئی۔ میں نے لاکھ پوچھا کہ نیت تو نماز کی تھی پھر یہ کہ دیر ہو رہی تھی، وغیرہ۔ مولوی صاحب اس دن کی گفتگو نہیں بھولے تھے، تپ کر بولے، دین آپ کی مرضی سے تو قوانین نہیں بدل سکتا۔ بات درست تھی، میں شرمندہ لیکن پژمردہ دکان میں واپس آ گیا۔

کیا ہوا سر جی؟ میرا منہ لٹکا دیکھ کر انور نے سوال داغا۔

میں نے اپنا دکھڑا رویا تو ہنس پڑا۔

ایسا کیا لطیفہ سنا دیا میں نے؟ میں نے تپ کر پوچھا۔

سر جی آپ روز جعلی دوائیاں بنا کر بیچتے تھے تو آپ کی نماز قبول ہو جاتی تھی اور درست ہوتی تھی، آج وضو کرنا بھول گئے تو نماز درست نہیں؟

گرگٹ

'جو تاویلات آپ کو قرآن میں ملتی ہیں وہ ہمیں کیوں نظر نہیں آتیں؟' نوجوان جج سے مستقل بحث جا رہا تھا۔ جینز پر کرتا زیب تن کیے، پیروں میں ٹینس جوتے۔ ادھیڑ عمر کا متوسط طبقے کا باپ آنکھیں دکھا رہا تھا مگر نوجوان اپنی دھن میں سب نظر انداز کیے ہوئے تھا۔

'تم کیا قرآن کو مجھ سے بہتر جانتے ہو؟' مولوی مشتاق نے حقارت سے پوچھا۔

'بات کم یا زیادہ کی نہیں ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا آپ مجھے موسیقی کے استعمال پر سزا دینا چاہتے ہیں۔ جبکہ مدینے شریف میں آمد پر خود رسول اللہ کا استقبال دف بجا بجا کے کیا گیا تھا' نوجوان ذہن پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔

'ناہنجار رسول کی برابری کرتا ہے' مولوی مشتاق آپے سے باہر ہو گئے۔ کرسی کو پیچھے دھکا دے کر کھڑے ہو گئے۔ جہاں دلیل کمزور ہونے کا امکان ہو وہاں زورِ بیان سے بات منوانی چاہیے۔ مولوی مشتاق کے منہ سے کف جاری تھا۔

'اس گستاخی کی سزا جانتا ہے' اب نوجوان واضح طور پر سہم چکا تھا۔ مولوی مشتاق نے نوجوان کو پانچ کوڑوں کی سزا سنائی۔ جہاں معاملہ اجتماعی بہتری کا ہو وہاں اختلافی آوازوں کو شروع میں ہی دبا دینا چاہیے۔

اگلا مقدمہ اس دن کا آخری کیس تھا۔ پیچیدہ مقدمے عموماً سب سے آخر میں رکھے جاتے ہیں تاکہ منصف کے موڈ اور تھکاوٹ کے حساب سے اسے سنا جا سکے۔ یہ آخری مقدمہ بظاہر سیدھا سادا تھا۔ ایک عورت نے اپنے گاؤں کے ایک مرد پر زنا کی رپٹ درج کرائی تھی۔ استغاثہ کی میز کے پیچھے بیٹھی اب بھی آنسو بہا رہی تھی۔ دو عینی شاہدوں نے ملزم کو رنگوں ہاتھوں پکڑ کر عورت کی جان بچائی تھی۔ دن بھر کے تھکے مولوی مشتاق کو عورت کی گریہ و زاری گراں گزر رہی تھی۔ وکیلِ استغاثہ کی طولانی داستان ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ مولوی مشتاق چک بائیس کی حقوق العباد کمیٹی کا چیئرمین تھا۔ پچھلے پانچ سالوں میں ایسے کتنے ہی مقدمے بھگتا چکا تھا۔ کوئی چھ سال پہلے ہونے والے تاریخی انتخابات میں عوام نے بے دینی عناصر کو شکست سے ہمکنار کیا تھا۔ اب ان چھ سالوں سے اس ملک پر وہ آئین نافذ تھا جو اس کا پیدائشی حق تھا۔ 'ہمارے اجداد نے اس کی بنیادوں کی اپنے عقائد اور خون سے آبیاری کی تھی' مولوی مشتاق نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا۔ معاشرے کو بے دین خیالات اور جدید مفروضات سے پاک رکھنا مولوی مشتاق اپنا فرض سمجھتا تھا۔ کئی دہائیوں کی لادینیت کے بعد ملک اب صراط المستقیم پر چل پڑا تھا اور مولوی مشتاق اپنے فیصلوں کی قوت سے اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔

'اس بی بی کی ٹیں ٹیں بند کرواؤ' مولوی مشتاق نے حقارت سے کالی چادر میں لپٹی، بین کرتی لاش پر نظر ڈالی۔ اس معاشرے کو سب سے بڑا خطرہ ان عورتوں سے ہے جو گھر کی چہار دیواری سے نکل کر زندگی کے دھارے میں برابری سے حصہ لینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

'وکیل صاحب آپ نے ایک ہی بات کی رٹ لگا رکھی ہے۔ اپنی معروضات کو مختصر رکھیں، اس عدالت کو اور بھی کام ہیں۔ پہلے یہ فرمایئے کہ آپ کی موکلہ کھیتوں میں اکیلی گئی ہی کیوں تھی۔ یہ تو بالکل آ بیل مجھے مار والا طریقہ ہے' مولوی مشتاق نے عدالت میں موجود لوگوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے نکتہ اٹھایا گویا یہ مقدمے کا بنیادی نکتہ تھا۔

مزید یہ کہ آپ کی موکلہ کے پاس کوئی ثبوت ہے اس گھناؤنے الزام کا۔ ان لوگوں کی عادت ہے خود برائی کرتی ہیں اور پھر الزام کسی شریف آدمی پر لگا دیتی ہیں۔ اس طاہر کی داڑھی دیکھو، یہ تمھیں زانی نظر آتا ہے۔ میں نے اس کی محلّہ کمیٹی سے چھان بین کی ہے، نمازی آدمی

ہے اور آپ کی موکلہ، کچھ مذہب کا علم ہے اس کے پاس۔ چار گواہوں کا حلفیہ بیان چاہیے مجھے ورنہ اپنا گناہ کسی اور کے شانوں پر نہ رکھیں' مولوی نے طاہر نام کے ملزم کی طرف اشارہ کیا۔

'کلمہ پڑھ طاہر کہ تو نے یہ گندا کام نہیں کیا' مولوی مشتاق نے گویا اشارہ کیا کہ مقدمہ شروع ہونے سے پہلے ہی اپنے اختتام کی طرف گامزن ہے۔

'لا الہ الا اللہ' طاہر نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا۔

'مگر جنابِ عالی دو گواہ موجود ہیں۔ ڈاکٹر کی رپورٹ منسلک ہے۔'

'میری تو دنیا اجڑ گئی، یہ کیسا انصاف ہے' کالی گٹھری میں گویا جان پڑ گئی۔

'یہ کیسا انصاف ہے؟' مولوی مشتاق بھڑک اٹھے۔ ڈاکٹر ہم سے زیادہ جانتا ہے۔ اس کالک کے لیے تمھارے اوپر مقدمہ چلے گا۔ یہ کمیٹی ایک ہفتہ بعد پھر بیٹھے گی۔ اس وقت تک اس کو زنانی جیل میں رکھو، فیصلہ ہونے تک یہ برائی بند رہے۔'

'ملزم طاہر کو بھی دوبارہ آنا ہوگا' یہ کہہ کر مولوی مشتاق نے انصاف کے تقاضے پورے کر دیے اور اپنی کرسی پیچھے کھسکا دی۔ مقدمہ برخاست تھا۔ جب سے ملک میں مولوی مشتاق کا تفسیر کردہ آئین نافذ ہوا تھا، انصاف سستا اور بروقت مہیا تھا۔'انصاف دیر سے ملنا نہ ملنے کے برابر ہے' مولوی نے مشہور کہاوت اپنے ذہن میں دہرائی۔

کمیٹی کا دفتر میونسپل کارپوریشن کی نچلی منزل کے آخری کمرے میں تھا۔ چھت پر پنکھا گرم ہوا کو چاروں طرف انصاف سے تقسیم کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ اس پنکھے کی کامیابی خود مولوی مشتاق سے کچھ ایسی بہتر نہ تھی۔ میز کے سامنے تین کرسیاں رکھی تھیں جن پر کمیٹی کے ممبر براجمان تھے۔ مولوی مشتاق کی کرسی درمیان میں تھی۔ درمیانی کرسی دائیں بائیں کی کرسیوں سے ایک بالشت بلند تھی۔ مولوی مشتاق نے چنیوٹ سے کرسی کی پشت نہ صرف بلند بلکہ ایسے رحل کی شکل کی بنوائی تھی کہ کسی کو شبہ نہ رہ جائے کہ چیرمین کون ہے۔ کرسی کے پیچھے والی دیوار پر ایک طرف قائدِاعظم کی تصویر ایستادہ تھی۔ شیروانی اور علیگڑھ پاجامے میں۔ ایک آنکھ کا چشمہ لگائے وہ مولوی مشتاق کو کڑی نظروں سے گھور رہے تھے۔ اپنی نوکری بچانے کی خاطر مولوی مشتاق کو اس تصویر کے ساتھ صلح کرنی پڑی تھی۔ دوسری دیوار پر خانۂ کعبہ کی تصویر

تھی، جس کو مولوی مشتاق روزانہ خود اپنے انگوچھے سے صاف کرتے تھے۔

کالی چادر آج کا آخری مقدمہ تھا۔ صبح سے اب تک یہ کمیٹی سولہ مقدمے نبٹا چکی تھی۔ پیر کا دن عموماً ایسا ہی مصروف گزرتا۔ جمعہ، ہفتہ اور اتوار کی تعطیل کے بعد، تین دن کے ملزمان اکٹھے پیش ہوتے۔ آج دو مقدمے کالج کے لڑکوں کے تھے جو گاؤں سے متصل بڑی سڑک پر موسیقی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان کو کوڑے کھانے کے بعد اپنا سفر جاری رکھنے کی اجازت تھی۔ دو عورتیں بغیر اپنے محرم کے دکان میں خریداری کے جرم میں لائی گئی تھیں۔ تین دکان دار وڈیو فلم جیسے کالے دھندے میں ملوث تھے۔ ایک جہنمی غیر شادی شدہ جوڑا ٹیوب ویل کے پاس سے لایا گیا تھا۔ اس نوع کی بے راہ روی اور معاشرتی پراگندگی مولوی مشتاق کے غیض وغضب سے مثالی سزا پاتی۔ پچھلے چھ سالوں میں ان جرائم کی تعداد میں خاصی کمی ہو گئی تھی۔ جب سے محکمۂ اوقاف نے انسدادِ گناہ دستے' قائم کیے تھے معاشرتی برائیوں میں واضح کمی آ گئی تھی۔ کچھ خود ساختہ سماجی کارکنوں کا کہنا تھا کہ برائیاں کم نہیں ہوئیں اندرون ہو گئی ہیں، مگر اس قسم کے لوگ ہر معاشرے میں پائے جاتے ہیں، ترقی کے مخالف لکیر کے فقیر۔ یہ درست ہے کہ زیادہ تر موسیقی کے مقدمات اب لب سڑک نہیں بلکہ درونِ خانہ سے لائے جاتے۔ چہار دیواری شاید آپ کی ہو مگر اس میں حکم چلتا تھا مولوی مشتاق اور اس قسم کے دیگر مصلحین کا۔ زیادہ تر مخبری پڑوسی سے ہوتی، انسدادِ گناہ دستے کے کامیاب چھاپے۔ ان دستوں کے پاس وسیع اختیارات تھے۔ خود مولوی مشتاق نے دو سال ان میں خدمات انجام دی تھیں، اب وہ ترقی پا کر حقوق العباد کمیٹی کے چیئر مین تھے۔

کمیٹی کے اجلاس سے نکل کر مولوی مشتاق باہر آئے تو گرم ہوا کے تھپیڑوں نے ان کا استقبال کیا۔ اپریل کے مہینے میں ابھی سے اتنی گرمی۔' قربِ قیامت کے آثار ہیں۔ یہ سب بے راہ روی کا انجام ہے۔ اللہ پاک ایسے ہی سزا دیا کرتا ہے۔' مولوی نے انگوچھے سے ماتھے کا پسینہ صاف کیا۔ مولوی کو آتا دیکھ کر ڈرائیور جلدی سے گاڑی لے آیا۔ حقوق کمیٹی کی چیئر مینی کے ساتھ محکمۂ عدل سے گاڑی اور دیگر مراعات بھی ملی تھیں۔ مولوی نے جیب سے تسبیح نکال کر دانے دانے پر گردان شروع کر دی۔ سر کے اشارے سے ڈرائیور کو گھر چلنے کا اشارہ کیا۔ گاڑی چوک

سے نکل کر بڑی سڑک پر آ گئی۔ دونوں جانب ایستادہ درخت گرمی کی تمازت کو کم کر رہے تھے۔ آج شام کی پرواز سے انھیں اسلام آباد بھی جانا تھا۔ کچھ ہی مہینوں میں شوال کے رویتِ ہلال کا اجلاس ہونا تھا۔ پچھلے سال دو ضلعی کمیٹیوں سے چاند کی شہادت مل گئی تھی لہٰذا ان اضلاع میں عید ہوگئی، باقی اضلاع میں عید دوسرے دن منائی گئی۔ کچھ بد خواہوں نے احمقانہ مشورے دیے کہ اس سائنسی دور میں رویتِ ہلال کا حساب مہینوں پہلے سے لگایا جا سکتا ہے۔ مولوی اس خرافات کے سخت خلاف تھے۔ گویا سائنس نہ ہوئی علم الغیب ہو گیا۔ ایسے میں مولوی مشتاق کی مدلل تقریر نے میدان مار لیا۔ بات صاف تھی کہ مستقبل کا حال تو صرف اللہ جانتا ہے پھر سائنس کیسے پیش گوئی کر سکتی ہے۔ نعوذ باللہ دنیاوی علم اب خدائی سرحدوں کو چھونے لگا، جہاں اس کے پر جلنے لگیں گے۔ مولوی مشتاق کے دلائل کی بازگشت اب تک دیواروں سے ٹکرا کر نادانوں کی رہنمائی کر رہی تھی۔ لہٰذا اس سال بھی رویتِ ہلال کمیٹی کے اجلاس کا انتظام ان ہی کے سپرد ہوا تھا۔ وہ تو خیر ہوئی اسلام آباد کا سفر ان کے سر پر سوار تھا ورنہ وہ دو لڑکیاں ان کے غضب سے نہ بچتیں جن کا حجاب ان کے سر سے ڈھلک گیا تھا اور وہ ابھی ابھی گاڑی کے پاس سے گزری تھیں۔ ورنہ کوئی دو سال پہلے ایسے ہی ایک بے نقاب چہرے پر تیزاب پھینکنے کے مجرم کو مولوی مشتاق نے جہادی عمل قرار دے کر بری کر دیا تھا۔ بہت بحث اور ہنگامے کے بعد محکمہ تعلیم و نظامت نے لڑکیوں کو آٹھویں جماعت تک پڑھنے کی اجازت دے دی تھی۔ مولوی مشتاق کا ووٹ اس کے خلاف تھا۔ لڑکیاں گھروں میں قائدہ، تحفۃ النساء اور قرآنِ پاک پڑھ سکتی ہیں۔ اس سے زیادہ پڑھنے سے اور وہ بھی اسکول کے ماحول میں، ان کا ذہن بلوغت سے پہلے ہی آلودہ ہو جاتا ہے۔

مولوی مشتاق گھر کے دالان میں داخل ہوئے تو نیک بخت نے استقبال کیا۔ انھی کے قصبے کی تھی۔ باپ مسجد میں نماز کے بعد مولوی مشتاق سے محوِ گفتگو تھا۔ مولوی مشتاق کو جب علم ہوا کہ بارہ سن کی لڑکی ہے اور ابھی تک قرآن کی تعلیم شروع نہیں ہوئی تو انھیں بہت دکھ ہوا۔ باپ کو سخت سست کہا اور اپنی خدمات پیش کیں۔ لڑکی ایسی کوڑھ مغز لیکن خوش شکل نکلی کہ آٹھ سال پڑھاتے رہے اور بالآخر اٹھارا سال کی عمر میں اس نیک بخت کو بیاہ کر گھر لے آئے کہ جو سبق

رہ گئے ہوں وہ بھی از بر ہو جائیں۔ یہ آج سے کوئی پندرہ برس پہلے کی بات ہے۔ اب ماشاء اللہ مولوی مشتاق خود چار بچوں کے باپ تھے۔ سب سے بڑا لڑکا میٹرک میں تھا اور چھوٹی گھر میں ہی چوتھی کا درس لے رہی تھی۔ درمیان میں اوپر تلے کی دو بیٹیاں تھیں انھوں نے بھی گھر پر ہی قاعدہ اور قرآن ختم کیا تھا۔ اب گھر پر رہ کر امورِ خانہ داری میں طاق ہوگئی تھیں۔ گھر میں فرج، ٹی وی ماشاء اللہ سب تھا۔ گھر سے جاتے وقت مولوی مشتاق ٹی وی کا کیبل نکال کر ساتھ لے جاتے تا کہ بچیاں اول فول پروگرام دیکھ کر بگڑ نہ جائیں۔ مولوی صاحب کی موجودگی میں بیشتر ساتھ بیٹھ کر خبریں، نعت اور قوالی دیکھنے کی اجازت تھی۔ لڑکے ابھی تک اسکول سے نہیں آئے تھے۔ نیک بخت نے بچیوں کو آواز دی کہ مولوی صاحب کا کھانا ان کے کمرے میں ہی لے آئیں۔ جتنی دیر کھانا کھاتے رہے، نیک بخت پنکھا جھلتی رہی۔

'مولوی صاحب اجازت ہو تو کل ارم کے گھر ہو آؤں' نیک بخت نے جو انھیں مولوی صاحب کہنا شروع کیا تھا وہ شادی کے بعد بھی نہ چھوٹ سکا۔

'ابھی دو ماہ پہلے تم اپنی بہن کے ہاں ہو کر آچکی ہو۔ ابھی فی الحال ضرورت نہیں' مولوی مشتاق نے یہاں بھی مقدمہ سرعت سے نبٹا دیا۔

'ہاں میرے کپڑے بیگ میں رکھ دو، جوتے پالش ہو جائیں تو اچھا ہے۔ اور یہ برتن اٹھالو بھئی میں کچھ دیر سولوں' چلو اب تم لوگ نکلو کمرے سے'۔

اسلام آباد جانے میں ہمیشہ مولوی مشتاق کو مزہ آتا۔ خوش لباسی اور خوش خوراکی دونوں کے بہم مواقع ملتے تھے۔ محکمۂ اوقاف کی طرف سے ہمیشہ بہترین ہوٹل میں رہائش ملتی اور کھانا بھی سرکار کی طرف سے۔ پھر میٹنگوں اور ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ان ملاقاتوں کی افادیت یہ کہ ان حضرات سے کئی کام نکلتے تھے۔ ابھی پچھلے ہی سال انھوں نے پڑوسی کے لڑکے کے لیے کھڑے کھڑے نوکری کا پروانہ نکلوا لیا تھا۔ مولوی مشتاق کی شرط یہ تھی کہ لڑکا داڑھی بڑھا لے تو نوکری دلوا دیں گے۔ واقعی مولوی صاحب اپنے وعدے کے پکے نکلے۔ ممنون پڑوسی نے اپنے لڑکے کی خدمات پیش کیں کہ مولوی صاحب چاہیں تو بیٹا جو دینیات میں ایم اے ہے اور

اکثر نمازی بھی، گھر آ کر بیٹیوں کو قاعدہ پڑھا دیا کرے۔ مولوی مشتاق چوکنا ہو گئے جیسے کوئی چور بعد مدت کے نظر آ گیا ہو، اس سختی سے انکار کیا کہ بات وہیں ختم ہو گئی۔

ادھر کوئی دو سال پہلے جب مولوی مشتاق اسلام آباد میں ٹھہرے تھے تو ایک منچلے بیرے نے ان سے دریافت کیا 'اور کوئی خدمت'

'میاں اور کیا خدمت کر سکتے ہو' مولوی صاحب نے مزاحاً پوچھا۔

'آپ حکم کریں جو شوق کریں گے حاضر ہے۔ رازداری کہنے کی بات نہیں'۔

طوعاً کرہاً اور کچھ اپنی طبیعت کی نیکی سے مجبور کہ کسی کو ناں نہیں کہہ سکتے مولوی صاحب نے انکار نہیں کیا۔ رات دس بجے جب مولوی صاحب کے کمرے کا دروازہ بجا تو گویا خرمن پر بجلی سی کوند گئی۔ ایک قصباتی مولوی کو بڑے شہر کی دھند نگل گئی۔ ایسے حواس باختہ ہوئے کہ دین و ایمان سب کھو بیٹھے۔ اس وقت سے اسلام آباد کے دورے جلدی جلدی پڑنے لگے۔ جیسے مرگی کے مریض کو دیر تک دوا نہ ملے تو دورہ پڑ جاتا ہے کہ اب لوگ علاج کے لیے دوا ٹپکائیں گے ہی۔ آج بھی اسی خیال سے ان کے ذہن میں گدگدی ہونے لگی۔

جہاز میں بیٹھے تو ایر ہوسٹس کو مسکرا کے دیکھا۔ ان کی خدمت کرتے ہوئے اس کے سر سے حجاب سرک گیا مگر مولوی مشتاق کی نظر سے اوجھل رہا۔ اسلام آباد کا موسم خود بخود اچھا لگنے لگا، حالانکہ یہاں گرمی شاید ان کی توقع سے زیادہ تھی۔ ایر پورٹ سے گاڑی سیدھی ہوٹل لے گئی۔ اب دونوں وقت گلے مل رہے تھے اور صبح سے پہلے ان کی کوئی مصروفیت نہیں تھی۔

'آپ کے یہاں جو ویٹر ہے، خادم، اسے میرے کمرے میں بھیج دیجیے۔ اس نے پچھلی دفعہ میری شیروانی بہت اچھی استری کی تھی' مولوی نے ریسپشنسٹ سے کہا۔

'جی اس کی استری کی کئی لوگ تعریف کر چکے ہیں' ریسپشنسٹ کے طنز کو مولوی مشتاق درگزر کر گئے۔

خادم نے اس دفعہ بھی اپنے نام کی لاج رکھی اور رات سے پہلے مولوی مشتاق کی تنہائی کا ساتھی مہیا کر دیا۔ لڑکی کیا تھی، قیامت سے پہلے قیامت تھی۔ کوئی انیس کا سن، کم بخت شوخ ایسی

کہ چٹکی بھرے تو دل چاہے کہہ دیں 'ایک بار پھر'۔ مولوی سیاں اس انداز سے شناسا تھے۔ وہ فتنہ بھی آج ان سے کھیلنے کا تہیہ کیے تھی۔

'مولوی صاحب آپ کو گھٹنوں کے بل چل کر ہم تک آنا ہوگا' ہائے اس شوخ کی طنازی۔

'وہ طفل کیا گرے کہ جو گھٹنوں کے بل چلے' مولوی مشتاق نے بے محل مصرع پڑھ کر اپنی خفت کم کرنے کی کوشش کی۔ دھم سے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کر منزلِ مقصود کی جانب گھسٹنے لگے۔

رکھوالے

مجھے نہ جانے کیوں ہمیشہ سے ڈاکیے کا بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔ یقین جانیے آج تک کوئی تعریفی یا توصیفی خط نہیں آیا، لہٰذا یہ وجہ تو ہو نہیں سکتی۔ یا پھر ممکن ہے کہ لاشعور میں یہی وجہ ہو کہ کون پہلا پتھر پھینکتا ہے۔ خیر آج بھی ڈاکیہ آیا تو میں اپنی ڈاک کے لیے تیار تھا۔ روزانہ تقریباً ستر فیصد ڈاک تو ردی ہوتی ہے اور تیس فیصد مختلف اقسام کے بل۔ زیادہ اچھا دن ہوگا تو صرف ردی ہوگی کوئی بل نہیں ہوگا۔ ڈاک میں ایک آدھ رسالہ بھی آرہا ہو تو سمجھیں گویا عید یا بقرعید ہوگئی۔ بس یہی کرم کیا کم ہے کہ مرزا کی طرح کھلے خطوط نہیں آرہے ہوتے۔ خیر آج کی ڈاک میں بھی وہی روزانہ جیسا کوڑا تھا لیکن ساتھ ہی ایک بہت سرکاری شکل وصورت کا لفافہ بھی میرے نام اور پتے کے ساتھ موجود تھا۔ اس قسم کے لفافے عموماً چندے کی درخواست کے ہوتے ہیں، لیکن اس کی بو باس میں بات کچھ مختلف تھی۔ کھول کر دیکھا تو ایک دعوت نامہ نکلا، جی دعوت نامہ۔ محترمی ومکرمی فلاں فلاں آپ سے درخواست ہے کہ کراچی چڑیا گھر کے گورننگ بورڈ کی ممبر شپ قبول فرمایئے۔ مدتِ عہدہ دو سال ہے، ہمیں یقین ہے کہ آپ کی بورڈ میں موجودگی سے چڑیا گھر کی افادیت میں اضافہ ہوگا۔ لیجیے صاحب لوگوں کے نام اسکول بورڈ، ہسپتال بورڈ، کسی کمپنی یا فیکٹری بورڈ کی نامزدگی آتی ہے، ہمارے نام چڑیا گھر کے بورڈ کی نامزدگی آئی ہے۔

شاید کسی دوست نے مذاق کیا ہے۔ کیا انسان کے شجرۂ نسب کی طرف پر مذاق اشارہ ہے۔ کیا واقعی چڑیا گھر کا بھی کوئی بورڈ ہے اور اگر ہے تو ہمارا اس میں کیا کردار ہوسکتا ہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد ہمارے اکثر دوست اس قسم کے مشغلوں میں مصروف ہیں لیکن یہ تو کسی کو بتانا بھی مشکل ہوگا کہ میں چڑیا گھر کے بورڈ میں ہوں ۔ یہ تو ایک کھلی دعوت ہے دوستوں کے نام کہ آؤ ہمیں چھیڑو۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس دعوت نامے کو پھاڑ دوں کہ فون کی گھنٹی بجی۔

'حامد صاحب'

'جی بول رہا ہوں'

'سر میں کمشنر آفس سے ان کا پی اے بول رہا ہوں، کمشنر صاحب نے آپ کو ایک دعوت نامہ بھیجا ہے، جس میں آپ کو چڑیا گھر کے گورننگ بورڈ کے لیے نامزد کیا گیا ہے۔ آپ کو آج یا کل کی ڈاک میں موصول ہو گیا ہوگا۔'

'یہ کیا مذاق ہے میاں؟'

'سر جی یہ مذاق نہیں ہے۔ چڑیا گھر کا ایک گورننگ بورڈ ہے، جس کے پندرہ افراد ممبر ہیں۔ ایک حاضر ممبر تبدیل ہو کر امریکہ جا رہے ہیں، ان کی جگہ خالی ہوئی تھی۔ سر بہت سفارشیں آ رہی ہیں۔ لیکن کمشنر صاحب نے اخبارات میں آپ کے کالم پڑھے اور حقوقِ جانوران کے متعلق آپ کے خیالات سے وہ بہت متاثر ہیں۔ ان کے خیال میں آپ کی موجودگی سے اس کی قدر و قیمت بڑھ جائے گی۔ ہفتے کی رات پہلا اجلاس ہے، ہم آپ کا انتظار کریں گے۔' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میرے احتجاجی کلمات میرے حلق ہی میں دبے رہ گئے۔ کمشنر کا پی اے غالباً احتجاجی کلمات کا عادی نہیں ہے لہٰذا بات کو بلا وجہ طول دینے کا فائدہ۔ پیغام آپ تک پہنچ گیا بس تعمیل کیجیے۔

میں بھی نہ جانے کس موڈ میں تھا کہ ہفتے کی شام تیار ہو کر سٹی ہال پہنچ گیا۔ میرے خیال میں یہ ایک اچھی منصوبہ بندی ہے کہ چڑیا گھر کے نظم و نسق اور دیکھ بھال کی تدبیر وسطِ شہر کے ایک دفتر میں کی جائے۔ ایر کنڈیشنر کی ٹھنڈک اور لپٹن کی گرم چائے کے گھونٹ دماغ کے بند دریچے کھولنے کے لیے کافی ہیں بہت سے بے وقوف لیاری کے مسائل بیچ لیاری میں بیٹھ کر حل

کرتے ہیں، چڑیا گھر کی تفصیلات چڑیا گھر جا کر معلوم کرتے ہیں، بورڈ ممبر نہ ہوئے گھوڑے گدھے ہوگئے۔

مستطیل میز کے گرد تقریباً سولہ کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ کوئی سات آٹھ ممبران پہلے ہی آچکے تھے۔ میں نے چیئر مین کے پاس جا کر اپنا تعارف کرایا تو انھوں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ بورڈ کی کاروائی کا ابتدائی حصہ نسبتاً غیر متنازع ایجنڈے پر مبنی تھا۔ چڑیا گھر میں ہر ہفتہ ایک نئے اسکول کے بچوں کو مفت داخلہ دیا جائے۔ کوشش کی جائے کہ چڑیا گھر میں کوئی باہر کا جانور نہ لیا جائے۔ اپنے ہاں بھانت بھانت کے جانور کم ہیں کیا۔ انتظامیہ کی جانب سے داخلہ فیس میں اضافہ کی درخواست بھی پیش ہوئی۔

'بھئی میرے خیال میں تو جانوروں کو دیکھنے کے لیے داخلہ فیس خاصی تگڑی ہونی چاہیے۔' چراغ دین چائے والا ایک بہت امیر و کبیر میمن گھرانے کے چشم و چراغ تھے، بورڈ کے بہت پرانے ممبر۔ چراغ دین صاحب کا شروع شروع میں تو صرف چائے کا کاروبار تھا مگر اب کہتے ہیں چینی، دودھ وغیرہ پر بھی ان ہی کی اجارہ داری ہے۔

'غریب لوگوں کے لیے یہ ایک سستی تفریح کا ذریعہ ہے آپ کیوں داخلہ فیس بڑھانا چاہتے ہیں؟' میں نے حیرت سے سوال کیا۔

'بھئی نئے ممبر صاحب، جس چیز کو دیکھ کر آپ کو اپنی برتری کا احساس ہو اس کی فیس تو پھر زیادہ ہونی ہی چاہیے ناں' چراغ دین چائے والا نے منطق پیش کی۔

'بھئی اگر چراغ دین صاحب کی منطق ٹھیک ہے تو پھر کراچی کے کلفٹن اور ڈیفنس والوں سے بھی بھاری فیس لینی چاہیے، جب بھی وہ شہر کے دیگر علاقوں کا دورہ کریں' حشمت صاحب نے مسکرا کے لقمہ دیا۔

'میں سمجھا نہیں'

'رہنے دیجیے، سمجھتے تو رو پڑتے، نہ سمجھنا ہی بہتر ہے۔' حشمت صاحب نے پیار سے سمجھایا۔

چڑیا گھر میں داخلے کے ٹکٹ کا معاملہ طے ہوا تو ایک اور گمبھیر مسئلہ ایجنڈے پر موجود تھا۔ چڑیا گھر میں شاید کچھ خطرناک جانور بھی موجود تھے۔ ایک ممبر نے تجویز پیش کی تھی کہ ان

خطرناک جانوروں کو ختم کر دیا جائے۔

'ارے صاحب یہ کہاں کا انصاف ہے؟' میں نے پرزور احتجاج کیا۔

'تو جناب کیا اس بات کا انتظار کریں کہ یہ جانور کسی پر حملہ کر دیں، کسی کو مار دیں۔' صفی اللہ صاحب حلیے بشرے سے بہت نیک اور پرہیز گار آدمی لگتے تھے، دیکھ کر ہی آدمی خود بہ خود مرعوب ہو جائے۔

'نہیں انتظار مت کریں، لیکن کیا ان جانوروں نے کسی پر حملہ کیا ہے؟'

'ابھی تو نہیں کیا، بس موقع کی تلاش میں ہیں، سدباب بہتر ہے۔'

'لیکن ہمیں کیا پتہ کہ موقع ملا تو یہ ضرور حملہ کریں گے۔' میں قائل نہ ہو سکا۔

'بھائی شیر اگر بھیڑ کی کھال اوڑھ لے تو وہ بھیڑ تھوڑے ہی بن جاتا ہے۔ موذی کو اس کے حملے سے پہلے ہی مار دو۔' صفی اللہ کی منطق میں شاید جان رہی ہو اس لیے کہ ایک دو دیگر بورڈ ممبران بھی سر ہلا کر اس کی تائید کر رہے تھے۔

'لیکن دیکھیے ان میں سے بہت سے تو نوعمر جانور بھی ہوں گے۔'

'تو کیا ان کے بڑے ہونے، خوں خوار ہونے کا انتظار کریں۔ واہ صاحب خوب مشورہ ہے آپ کا۔ کھلا پلا کر خوں خواروں کی نسل افزود کی جائے۔' صفی اللہ ناراض معلوم ہونے لگے۔

'نہیں جناب میرا مقصد یہ ہے کہ یہ جانور بھی اسی جنگل کا ایک حصہ ہیں۔ آپ پورے مسئلہ کا ایک غیر جانبدارانہ جائزہ لیں۔ جو جانور ایک بار بھی حملہ کر چکا ہو، اسے ضرور علیحدہ کر دیں، سزا دیں، ملک بدر کر دیں، لیکن جن جانوروں نے کبھی کوئی جارحیت نہیں دکھائی ان کے ساتھ یہ سلوک زیادتی ہے۔'

'میاں آپ مجھے بائیں بازو کے علیحدگی پسند لگتے ہیں' صفی اللہ اب ہتھے سے اکھڑ رہے تھے۔

'چیئرمین صاحب یہ کس کی سفارش پر آئے ہیں، بھئی آپ تو ناصر صاحب کو ہی امریکہ سے واپس بلوالیں۔ یہ تو بہت کج بحثیے ہیں۔' چراغ دین صاحب نے لقمہ دیا۔

'تو آپ کے پاس کیا دلیل ہے کہ یہ جانور ضرور چڑیا گھر کی سیر پر آنے والوں کے لیے ضرر آمیز ہیں' مجھے لگا حشمت صاحب نے میری حمایت میں سوال کیا ہے۔

'ارے بھئی آس پاس کے ممالک کے چڑیا گھروں کی تاریخ ہی سے کچھ فائدہ اٹھاؤ۔ کئی جگہ سے ایسی کئی رپورٹیں آئی ہیں۔' صفی اللہ اپنا ہوم ورک کر کے آئے تھے۔

'لیکن ان ممالک کی آب و ہوا مختلف ہے۔ کیا معلوم کس طرح جانوروں پر اثر انداز ہوئی ہو۔ ہمارے یہاں آب و ہوا معتدل ہے۔ بغیر چھیڑے یہ جانور نہیں چھیڑتے۔ اگر ہم احتیاط رکھیں تو یقیناً معاملہ قابو میں رہے گا' حشمت صاحب کی شہ پر میرے حوصلے بھی بڑھ گئے تھے۔

'دیکھیے اگر اپنے مفادات پر ضرب کا اندیشہ ہو، یہ احتمال ہو کہ کوئی جانور آپ پر حملہ کر سکتا ہے تو میرے خیال میں سد باب کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ایسا وقت آنے سے پہلے ہی اس کا کام تمام کر دیا جائے' صفی اللہ نے پھر کوشش کی، دھیمے لہجے میں مجھے سمجھایا۔

'ہمارا تمدن یونانی اکھاڑوں اور چڑیا گھروں کی تقلید کرتا رہا ہے، اس دور سے آج تک کوئی نظیر نہیں ملتی، یہ کوئی نیا فلسفہ ہے کیا۔'

'فلسفہ نیا ضرور ہے، اس لیے کہ نئی صدی ہے، نئے تقاضے ہیں اور پھر نیا بورڈ ہے۔ ہم بورڈ ہیں، ہم مالک ہیں، جیسا چاہیں فیصلہ صادر کر دیں' چراغ دین نے بہت فخر سے کہا۔

'بھئی اپنا صفی اللہ صاحب وہ کیا اچھی کتاب دی تھی آپ نے مجھے پڑھنے کو Pre-emptive strike، وہ دیجیے اپنے نئے ممبر صاحب کو پڑھنے کے لیے۔ ان کے خیالات میں ابھی تک بہت Immaturity ہے، بہت رومان پرور، بہت یوٹوپیا زدہ، ابھی سیکھنے کی بہت گنجائش ہے۔'

'میرے خیال میں فی الحال اس قرارداد کو Table کر دیں۔ سب بورڈ ممبران دوبارہ ذرا اس کا جائزہ لے لیں، تو ہم پھر دوبارہ اسے اٹھا سکتے ہیں۔' چیئرمین صاحب نے بالآخر کوئی راستہ نہ پا کر تجویز پیش کی۔

'ٹھیک ہے، ٹھیک ہے' کئی ممبران کی ایک ساتھ آواز ابھری۔

'آج کے ایجنڈے کا آخری نکتہ ہے عید پر جانوروں کے لیے تحائف کا انتخاب۔' یہ معاملہ مجھے نسبتاً آسان محسوس ہوا کہ جانوروں کو کچھ چارہ وغیرہ دے کر مسئلہ جلد نبٹ جائے۔ اجلاس کو شروع ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے اور اب تک کا میرا تجربہ مجھے بھاگ نکلنے کا

مشورہ دے رہا تھا۔

'دیکھیے میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ شیر، چیتا اور تیندوے وغیرہ کو عید پر دو دو خرگوش تحفے میں دیے جائیں' چراغ دین نے تجویز دی۔

'بات تو آپ کی ٹھیک ہے، لیکن خرگوشوں کو آپ کیا تحفہ دیں گے، خرگوشوں سے تو پوچھ لیں۔' حشمت صاحب بھی لگتا تھا میری طرح دل جلے تھے۔

'بھئی خرگوش سے کیا پوچھنا ہے۔ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا' صفی اللہ مسکرائے۔

'ہاں، ہاں لیکن پھر بھی قطرے سے پوچھ تو لیں۔'

'لو بھئی اب قطرے سے بھی پوچھنا پڑے گا۔ دریا سے پوچھ لیا یہ کافی نہیں ہے کیا؟' چراغ دین کی آواز میں تضحیک تھی۔

'کیسے اچنبے کی بات ہے کہ کچھ جانوروں کے لیے بہترین تحفہ یہ ہے کہ انھیں دوسرے جانوروں سے بچایا جائے، جبکہ دوسرے جانوروں کے لیے تحفہ یہ ہے کہ انھیں اپنے ہم عصروں پر چھوڑ دیا جائے؟' میری آواز کا تحیر بھی بقیہ بورڈ ممبروں کو سنجیدگی کی طرف مائل نہ کر سکا۔

'بھئی ان کے فلسفوں میں تو رات گزر جائے گی'۔ ایک ممبر نے میز کے دوسرے کونے سے بولی ماری۔

'آپ کیا کمیونسٹ ہیں؟' میرے دائیں جانب کرسی پر بیٹھے ایک بورڈ ممبر نے ہمدردی سے پوچھا۔

'اچھا کم از کم چھوٹے جانوروں کو مارنے کے بعد بڑے جانوروں کے پنجرے میں ڈالا جائے، بڑے جانوروں کو تو گوشت کھانے سے مطلب ہے ناں۔'

'اچھا ہوا آپ نے خود ہی یہ بات کہہ دی۔ کوئی خوددار درندہ مردہ خوئی نہیں کرسکتا۔ مقصد صرف گوشت کھانا ہی نہیں بلکہ زندہ خرگوش کی بھاگ دوڑ سے شیر کے جسم میں پھرتی پیدا ہوگی۔ آنکھ مچولی کا اپنا مزا ہے میاں۔ ایسا نہ ہو شکاری اپنا فن ہی بھول جائے۔ جنگل کا یہی قانون ہے، اپنی شکاریات تازہ رکھو ورنہ خود شکار ہو جاؤ گے۔ آپ کبھی شکار پر گئے ہیں۔ اپنا شکار کیا ہوا ہرن اور قصائی کی دکان پر لٹکا ہرن۔ بالکل دو مختلف ذائقے ہیں جناب۔' صفی اللہ

صاحب کی آواز میں طنز تھا یا نہیں میں کچھ فیصلہ نہیں کر سکا۔

'بھئی اور کچھ ہو نہ ہو آپ کے آنے سے گرمی بازار ضرور بڑھ گئی ہے۔' میرے داہنی ہاتھ پر بیٹھے ممبر نے پھر چوٹ کی اور چیر مین کی جانب استہفامی نظروں سے دیکھا۔

چیئر مین صاحب نے دھیمے سے کچھ کہا۔ مجھے صرف کمشنر صاحب سنائی دیا اور چیئر مین کے کاندھے اچکتے دکھائی دیے۔

'میرے خیال میں یہ قرارداد ووٹنگ کے لیے تیار ہے' چیر مین صاحب نے بحث سمیٹنے کا اشارہ کیا۔

'وہ تمام ممبران جو اس بات کے حق میں ہیں کہ خرگوش کو شیر کے پنجرے میں زندہ ڈالا جائے ہاتھ اٹھا دیں۔'

گیارہ ممبروں کے ووٹ سے یہ قرارداد پاس ہوگئی۔

'بہت سے ممبر صرف اس لیے ووٹ دے دیتے ہیں کہ جلدی معاملہ ختم ہو تو گھر جائیں۔' حشمت صاحب نے سرگوشی کی۔

'پھر ویسے بھی طویل بحث مباحثے کا فائدہ کیا۔ چند پرانے ممبران جو شروع سے بورڈ کے ممبر ہیں ان کے پاس حتمی ووٹ ہے' حشمت صاحب نے بات جاری رکھی۔

'حتمی ووٹ'

'ہاں حتمی ووٹ' یعنی اگر ان پرانے ممبران میں سے کوئی ایک بھی اس قرارداد سے راضی نہ ہو تو وہ لاگو نہیں ہو سکتی۔'

'یعنی سب ممبروں کے ووٹ بھی برابر کے نہیں' میں نے حیرت سے پوچھا۔

'قطعاً نہیں' وہ ہنس پڑے۔ 'لہٰذا آپ پچھلی قرارداد کی بہت زیادہ مخالفت نہ کریں۔ اگر سب ممبر ایک طرف ہوں اور ایک پرانا ممبر دوسری طرف تو بات ختم۔'

'توصفی اللہ؟' میں نے سرگوشی کی۔

'جی صفی اللہ انھی پرانے ممبروں میں سے ایک ہیں۔' حشمت صاحب کے ہونٹ تو ضرور ہلے لیکن منہ سے آواز نکلے بغیر پیغام مجھ تک پہنچ گیا۔

میں اپنی کرسی پیچھے دھکیل کر اٹھا اور چیئرمین صاحب سے معذرت کی کہ میں اس بورڈ کے لائق نہیں۔ نہ معلوم کیوں مجھے محسوس ہوا جیسے انھوں نے کچھ سکون کا سانس لیا ہو۔ ممبران کو بحث میں الجھتا چھوڑ کر باہر نکلا اور رکشہ پکڑ چڑیا گھر چل دیا۔ دیکھ لوں اس پہلے کہ خوں خوار ممبران اس کا تیا پانچا کر دیں۔

شمشان گھاٹ

خدا جانے یہ اس کمرے کی کشادگی تھی یا دیواروں پر چنی کتابیں۔ کچھ تو تھا جس نے مجھے یک دم مرعوب کر دیا۔ کسی سائیکولوجسٹ کے کمرے میں جانے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ میں کبھی نہ آتی اگر خالدہ ڈرا دھمکا کر نہیں بھیجتی۔ علمِ نفسیات کے اطراف جو ایک اسرار کا ہالہ ہے وہ مجھ جیسی ڈرپوک لڑکی کو دور رکھنے کے لیے کافی ہے۔ نامعلوم کیا کیا پوچھ لے، اور خدا جانے بلا پوچھے کیا کیا جان لے۔ اندر کہیں ایک دبی دبی خواہش بھی کہ بنا پوچھے سب جان لے اور مجھے میرے ماضی سے آزاد کردے۔ آپ اپنے ایمان سے کہیں آپ کے ماضی میں کتنی ہی یادیں ہیں جو آپ ساری دنیا سے چھپا کے رکھنا چاہتے ہیں، خواہ آپ سائکولوجسٹ کے سامنے ہی کیوں نہ ہوں۔ اور پھر حال میں کتنی خواہشیں برقعہ اوڑھے پھر رہی ہیں۔

ریسپشنسٹ نے اشارہ کیا تو میں کمرے میں داخل ہوئی۔ وسیع وعریض کمرہ، سفید شفاف روشن۔ دیواریں تصویروں اور کسی بھی قسم کی آرائش سے پاک۔ ڈاکٹر محمود خود پچھلی دیوار کے ساتھ ایک کشادہ میز کے تحفظ میں بیٹھے تھے۔ میز سے صرف اوپر کا آدھا دھڑ نظر آرہا تھا۔ بندے کا پورا آپ سامنے ہو تو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ ہاتھ کہاں دھرے ہیں، پیروں کی صورتِ حال کیا ہے، یہ سب بہت اہم ہے۔ تو جب آپ کسی سے گفتگو کریں جس کا آدھا جسم

میز کے پیچھے چھپا ہو تو یہی Advantage نروس کر دینے کے لیے کافی ہے۔ دروازے سے میز تک چودہ قدم بہت بے یقینی کے تھے۔ محمود ادھیڑ عمر، غالباً پچاس برس کی عمر، سفید قمیض پر ٹائی اور گیلس لگائے بیٹھے تھے۔ بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اپنے نچلے ہونٹ کو یوں چھپا رکھا تھا کہ اس سارے پوز سے بہت متاثر کن تصویر بنتی تھی، اور شاید مقصد بھی یہی تھا۔ یہ شخص دروازے سے میز تک کے سفر میں ہی غالباً مریض کا سارا حال جان لیتا ہے، میں نے دل میں سوچا۔

آیئے بیٹھیے، محمود کی آواز توقع کے برخلاف بالکل ڈراؤنی نہیں تھی۔

'جی شکریہ' میں میز کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

'اگر آپ وہ بدنامِ زمانہ سائکیاٹرسٹ کاؤچ ڈھونڈ رہی ہیں تو آپ کو مایوسی ہو گی۔ اس نئے زمانے میں کاؤچ سکڑ کر کرسی رہ گیا ہے۔' ڈاکٹر محمود نے غالباً میری گھومتی نظریں دیکھ لی تھیں، ہنس کر کہا، یا شاید یہ میرے دباؤ کو کم کرنے کی کوشش تھی۔

'کہیے کیا مدد کر سکتا ہوں میں آپ کی؟'

'ڈاکٹر صاحب ماضی کے کچھ ابواب بہت تنگ کرتے ہیں۔ میں نے آپ کی بہت تعریف سنی ہے۔ امید ہے آپ اس یادِ ماضی سے مجھے چھٹکارا دلا سکیں گے، یا اس سے لڑنے کا حوصلہ پیدا ہو جائے گا کہ ذکر آتے ہی کم از کم آنکھ میں آنسو نہ اتر آئیں۔'

'ضرور، کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔ آپ مجھے بتایئے کہاں پیدا ہوئیں، اپنے بچپن کے لمحات تفصیل کے ساتھ بیان کیجیے۔'

یوں اپنی زندگی کی وہ کتھا جو میں اپنی عزیز ترین دوست، خالدہ، کے سوا کسی کو نہیں سنا سکی تھی، بہت ذرا سی ہچکچاہٹ سے دہرانے لگی۔ دل شاید عرصے سے ایسے کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ جو وسوسے اور شکوک مجھے اپنی ذات کے بارے میں تھے، اپنے کردار کے بارے میں جو سوالات مجھے دن بھر الجھائے رکھتے شاید مجھے ان کے جوابات مل جائیں۔

'یہ جو پندرہ سالوں کے واقعات میں نے بیان کیے ہیں وہ تو آپ کو بہت لایعنی اور بے معنی سے لگے ہوں گے' میں زندگی کے اولین دس پندرہ سالوں کی کتھا سنا چکی تو ذرا وقفہ لیا۔

'یہ فیصلہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں، بولتی رہیے۔ یہی تو وہ تجربات ہیں جن سے آپ کی

آئندہ زندگی کا رخ متعین ہوگا۔ ہاں تو آپ کہہ رہی تھیں کہ جب آپ نے میٹرک ختم کیا تو آپ کے والد کا تبادلہ سرگودھا ہو گیا۔'

'جی ہاں ائرفورس کی ملازمت ایسی ہی ہوتی تھی۔ آج یہاں کل وہاں۔ سرگودھا گرلز کالج میرے لیے دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ کوئی دوست کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ پھر میرے والد کا خواب کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ ماہانہ امتحانات میں نمبر کم آتے دیکھ کر میرے والد نے میرے لیے ٹیوشن لگا دی۔ میرے ابو جی ٹیوٹر سے خود ملے۔ میری اور اس کی عمروں میں کوئی پچیس سال کا تفاوت تھا۔ احمر عباسی کی عمر تقریباً چالیس برس تھی۔ اس کی بڑی بیٹی مجھ سے عمر میں کوئی دو سال بڑی تھی جبکہ چھوٹی بیٹی تقریباً میری ہم عمر۔ احمر عباسی کی بیوی ان ہی کے گاؤں کی ایک سیدھی سادھی خاتون تھیں۔ احمر عباسی کی بیٹیوں کو دیکھ کر ابو نے ذرا سکھ کا سانس لیا۔ احمر کی شرط تھی کہ میں ٹیوشن پڑھنے اس کے گھر جاؤں۔ ابو اس بات کے بالکل حق میں نہیں تھے۔ لیکن کوئی دوسرا ٹیوٹر مل نہیں رہا تھا پھر احمر نے ابو کو یقین دلایا کہ وہ اپنی بیٹیوں کو تو پڑھاتے ہی ہیں میں بھی ساتھ شریک ہو جاؤں گی۔ یہ سن کر ابو نے اپنی مخالفت ترک کر دی اور مجھے احمر عباسی کے حوالے کر کے چل دیے۔ ابو کا یہ اطمینان مجھے بہت مہنگا پڑا۔

احمر عباسی بہت معمولی شکل وصورت کا آدمی تھا۔ لیکن صاف ستھرا شلوار قمیض، سلیقے سے جمے بال اور دھیمی مشفق آواز۔ یہی چیزیں مجھے احمر عباسی کے بارے میں سب سے زیادہ یاد ہیں۔ ٹیوشن کا دورانیہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹا رہتا۔ اندر کمرے میں پڑھانے کے بجائے اس نے باہر ایک بیٹھک نما کمرے میں پڑھانے کو ترجیح دی۔ یہ کمرہ عموماً مردانہ مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ان کی بیوی اور لڑکیاں یہاں قدم نہ رکھتے۔

'خاموشی اور سکون کی وجہ سے یہاں پڑھائی بہتر ہو سکتی ہے' احمر نے وضاحت کی۔

احمر ایک، دو گدیوں والے صوفے پر بیٹھتا، درمیان میں ایک چھوٹی سی میز اور اس کے دوسری طرف میں ایک کرسی پر بیٹھ کر پڑھتی۔ بیٹھک میں مشکل یہ تھی کہ پنکھا اکثر کام نہ کرتا۔ گرمی کی وجہ سے مجھے اکثر دوپٹہ اتار کر بیٹھنا پڑتا۔ اگر دوپٹہ شروع ہی سے پہناوے کا حصہ نہ ہوتو اتنے مسائل پیدا نہیں کرتا۔ لیکن اگر یہ لباس کا جزِو لازم ہو اور پھر اتر جائے تو بہت سے

مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ پندرہ برس کی عمر میں میرے جسم کی بناوٹ اور بھراوٹ بیس سال کی لڑکیوں جیسی تھی، اس مسئلے نے بھی معاملے کو بگاڑ دیا۔

مجھے لگا جیسے احمر کا پیر میرے پیر کو چھو گیا ہے۔ یہ ازخود کوئی سانحہ نہیں تھا۔ گرمی کی وجہ سے احمر عباسی اپنی سینڈل اتار کر بیٹھتا اور میرے پیروں میں وہی دو بادیوں والی چپل ہوتی۔ پاؤں چھونے کے بعد نہ صرف وہیں جم گیا بلکہ احمر کا پیر میرے پاؤں پر آ کر یوں ٹھہر سا گیا کہ جیسے یہ بہت فطری اور قدرتی بات تھی۔ میرے پاؤں میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ میں نے چور نظروں سے احمر عباسی کو دیکھا تو وہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا اور نظریں ملنے پر مسکرا دیا۔ میں اپنا پیر ہٹانے کی ہمت نہ کر سکی۔ دوسرے دن جیامیٹری کی ایک شکل سمجھ نہ آئی تو احمر نے مجھے اپنے برابر میں صوفے پر ہی بٹھالیا کہ دونوں ایک ہی سمت سے خطوط کو دیکھیں گے تو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

احمر کی معمولی شکل وصورت کے باوجود میں اب تک اس سے بہت متاثر ہو چکی تھی۔ سگریٹ کا کش لے کر وہ ایک بہت دلکش انداز میں دھویں کے مرغولے بناتا۔ اس سگریٹ کی بو کو مارنے کے لیے وہ اکثر چھوٹی الائچی کھاتا رہتا۔ 'میری بری عادت سے دوسروں کو تکلیف کیوں ہو' میرے استفسار پر اس نے الائچی کی توجیح پیش کی۔ احمر عباسی بہت اداس تھا۔ اس کی اپنی بیوی سے بالکل ذہنی ہم آہنگی نہیں تھی۔

'میں نہ جانے کیوں تمھارے سامنے یہ قصہ لے کر بیٹھ جاتا ہوں۔ تمھیں اس میں نہیں الجھنا چاہیے، یہ میری جنگ ہے میں خود لڑوں گا مجھے احمر عباسی پر بہت پیار آتا۔ کتنا اچھا اور عقلمند تھا بیچارہ۔ لیکن کتنا دکھی۔ کاش میں کسی طرح مدد کر سکتی۔ اس کی آنکھیں بہت کھوئی کھوئی سی رہتیں اور اپنی اداسی میں وہ کیسا خالی الذہن رہتا۔ اکثر میں دھیرے سے اسے آواز دیتی تو اسے شاید سنائی ہی نہیں دیتی پھر وہ یک دم چونک کر میری طرف متوجہ ہوتا، نجانے کس دنیا میں رہتا تھا۔

جیومیٹری کا مسئلہ سمجھنے کے لیے میں احمر عباسی کے برابر صوفے پر جا بیٹھی۔ جیومیٹری سمجھاتے سمجھاتے ایک دم سے وہ رک گیا۔

'میں تم سے کچھ مانگ لوں۔'

'ضرور سر ضرور مانگیں، میرے پاس ایسا ہے ہی کیا؟'

'انکار تو نہیں کرو گی۔'

'ارے پہلے بتائیں تو سہی۔'

'نہیں پہلے وعدہ کرو ورنہ میں اپنی بات فضول میں کھوؤں۔'

'ارے سر ایسی کیا بات ہے، وعدہ، وعدہ۔'

'اپنی آنکھیں بند کرو۔'

آنکھیں بند کرنا قیامت ہو گیا۔ آنکھیں کھلی رہتی ہیں تو مکھی نظر آ رہی ہوتی ہے۔ بند آنکھوں میں مکھی نگل لینے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ کیسی اچھی ڈھال ہے کھلی آنکھ۔ کتنے عذاب پرے رکھتی ہیں کھلی آنکھیں۔

احمر عباسی کے لب میرے لبوں پر پیوست ہو گئے۔ نہ جانے کتنی دیر کے لیے۔ شاید چند سیکنڈ، چند منٹ یا میری ساری زندگی کے لیے۔ میں جو اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھی سمجھ ہی نہ پائی کہ میرا ردِعمل کیا ہونا چاہیے۔ ایک بار ہاتھ جل جائے تو دوسری بار نہیں ڈالتے۔ لیکن اس پہلی بار کی آگ کو کس کھاتے میں ڈالوں۔ پیدائش کے وقت سے ہی ذہن، حواسِ خمسہ کے ذریعہ بیرونی دنیا کے خطرات سے خود شخصیت اور اس کے ردِعمل کی تراش خراش کرتا ہے۔ تجربوں سے ہمارے عمل کو سنوارتا ہے۔ چھونے، چکھنے، سننے، بولنے اور دیکھنے کی حس۔ خطرہ دائیں طرف سے آ رہا ہے تو ادھر ہو لو، اوپر سے وار ہو تو جھک جاؤ، بچ لو۔ یہ کلمات تکلیف دہ ہو سکتے ہیں، انھیں آئندہ نہ سننا۔ لیکن ان ہی حسیات نے جن شخصیات پر اعتماد کا سبق دیا تھا وہ یہاں مات کھا گئیں۔ جب حواس نے رہ نمائی سے انکار کیا تو میں احمر عباسی کے جسم سے چمٹ گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مجھے اس میں کوئی لطف محسوس نہیں ہوا تھا، بس ایک انجانا سا کراہت کا احساس تھا کہ کچھ غلط ہو گیا ہے۔ دل ایسے زور سے دھڑک رہا تھا کہ جیسے بس یہ دوڑ کے آخری سو میٹر ہیں۔

'سر یہ آپ نے کیوں کیا' میں نے شکایتی لہجے میں پوچھا۔

'بھئی میں نے تم سے پوچھ تو لیا تھا' احمر عباسی کے لہجے میں حیرانی تھی۔

اس دن میں جلدی اٹھ گئی۔ مرے مرے قدموں سے گھر پہنچی۔ ذہن ابھی اس نئے

حادثے کو سمجھ نہیں پایا تھا کہ کس خانے میں رکھے۔ ابو جی تین دن کے دورے پر کراچی گئے ہوئے تھے۔ ہوتے بھی تو شاید میں بتا نہ پاتی۔ کیا بتاتی۔ کسی طرح ہمت کر کے بتا بھی دیتی تو اس کے بعد جو حشر برپا ہوتا، اور پھر اس سب کی ذمہ دار بھی شاید میں ہی تھی۔

'میں نے تم سے پوچھ تو لیا تھا' احمر عباسی کی آواز گونجی۔ میں نے کیوں سر کو منع نہیں کیا۔ شاید میں خود ہی یہ چاہ رہی تھی، خیر کم از کم اس بات کا جواب مجھے حتمی طور پر پتہ تھا کہ ''نہیں'' میں ہے۔ دوسرے دن ٹیوشن سے کچھ دیر پہلے ابو جی کا کراچی سے فون آ گیا۔ ٹیوشن اور اسکول کا پوچھتے رہے۔ بیٹا ٹیوشن کا ناغہ نہ کرنا میرے پیچھے۔ میرا بڑا خواب ہے کہ میری بیٹی ڈاکٹر بنے۔ میں جو شاید اس دن دوبارہ نہ جاتی، یہ سن کر وہ دروازہ بھی بند ہو گیا۔ مرے مرے قدموں سے دوبارہ ٹیوشن لینے پہنچ گئی۔ احمر عباسی مجھے دیکھ کر کھل اٹھا، منہ سے کچھ نہ بولا۔ وہی روزانہ کا رویہ، جیسے کل قیامت آئی ہی نہیں تھی۔ آج میں دوپٹہ پہنے بیٹھی رہی تو احمر عباسی نے خود اتار کر ایک طرف رکھ دیا کہ 'پاگل مت بنو۔'

پھر یہ سلسلہ روز کا معمول بن گیا۔ بات ہونٹوں کی بے چینی سے بڑھ کر انگلیوں کی بیقراری تک پھیل گئی۔ شروع شروع میں ایک دو مرتبہ دست درازی کے بعد احمر عباسی تھوڑی دیر کے لیے شرمندہ دکھائی دیتا، معذرت خواہ بھی ہوتا، مگر اپنے جسم کی شمشان گھاٹ پر میری نوعمری کی چتا جلاتا رہا، لیکن شکر ہے بات ایک مقررہ حد سے آگے نہیں بڑھی۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ یہ حد خود اس نے کھینچی تھی ورنہ میں شاید ہی اسے روک پاتی۔'

ابھی میں یہیں تک کا ذکر کر سکی تھی کہ ریسپشنسٹ نے آ کر وقت ختم ہونے کا اشارہ دیا۔ ڈاکٹر محمود نے اسے ہدایت دی کہ اگلا مریض دس منٹ کے لیے روک لے۔

'مجھے آپ کے مسائل کا کچھ ادراک ہو چلا ہے۔ مجھے پہلے پتہ ہوتا تو آپ کے لیے زیادہ وقت رکھتا۔' ڈاکٹر محمود کی بات ختم ہونے سے پہلے میرا پاؤں اتفاقاً ان کے پاؤں سے چھو گیا۔ یہ اتفاق ہی کہلاتا اگر میں اپنا پاؤں ہٹا لیتی، مگر نہ جانے کیوں میرا پاؤں وہیں ٹھہرا رہا۔ ڈاکٹر محمود نے نظر اٹھا کے مجھے دیکھا تو میں مسکرا دی۔

'ٹھیک ہے آپ سیکریٹری سے دو دن کے بعد کا وقت لے لیجیے، اور اس سے کہہ دیں

آپ کو دو مریضوں کے برابر کا وقت دے تا کہ تفصیل سے بات ہو سکے۔' ڈاکٹر محمود کے جملوں میں وقت ختم ہونے کی یاد دہانی تھی، انھیں اپنے نئے مریض کا انتظار تھا۔ میں نے اٹھ کر ان کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ ہاتھ ملانے میں ڈاکٹر محمود کچھ ہچکچاہٹ کا شکار ہیں، مگر مریضہ کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کرنا بھی مشکل تھا، میں نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں ہی چھوڑ دیا۔

دو دن کے وقفے کے بعد میں ڈاکٹر محمود کے دفتر پہنچی تو وہ میرے منتظر تھے۔ یہ دوسری ملاقات تھی۔ دوسری ملاقات تک عموماً مانوسیت بڑھ جاتی ہے۔ میں نے ڈاکٹر محمود سے ہاتھ ملایا تو اس لمس میں مجھے لذت ملی۔ میں نے میز کے اس طرف والی کرسی سنبھال لی اور جوتے اتار کر بیٹھ گئی۔

'چلیے وہیں سے شروع کرتے ہیں جہاں قصہ چھوڑا تھا' ڈاکٹر محمود نے بڑھاوا دیا۔

'ڈاکٹر صاحب کیا بتاؤں۔ احمر عباسی کے ساتھ ٹیوشن نے مجھے وقت سے پہلے ان حقیقتوں سے روشناس کرا دیا جن کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ قدرت نے سیکھنے کا عمل بتدریج رکھا ہے۔ یہاں تو ہم بابِ اول سے سیدھے درمیانِ کتاب میں پہنچ گئے۔ احمر عباسی کی دست درازی جاری رہی۔ میں آج تک سمجھ نہیں پائی کہ میں اس کو روک کیوں نہیں سکی۔ میں آپ کو سچ بتا رہی ہوں کہ میں اس کو روکنا چاہتی تھی، جھٹک کر ہاتھ ہٹانا چاہتی تھی، اس کے منہ پر زوردار تھپڑ لگانا چاہتی تھی، مگر مجھ سے یہ کیوں نہ ہو سکا۔'

'احمر عباسی آپ کے ذہن کے کچے پن سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ آپ کی ذہنی عمر آپ کے جسم کی بلوغت سے پیچھے تھی۔ احمر کے پاس موقع تھا، تنہائی تھی اور پاس آدھی عمر کی لڑکی تھی۔ رشتوں کا تقدس بھول کر اس نے موقع کی قیمت وصول کرنی چاہی' ڈاکٹر محمود نے مجھے سمجھایا۔

'مگر ڈاکٹر صاحب ان تمام باتوں کے باوجود میں اسے کیوں منع نہ کر پائی' میں نے 'میں' پر بہت زور دے کر پوچھا۔ 'میرے نتائج خراب ہوتے چلے گئے، ٹیوشن سے فائدہ کے بجائے نقصان ہونے لگا۔'

'میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں' احمر عباسی نے اعلان کیا۔

خدایا یہ کیسی محبت ہے جو صرف عملی اظہار کی خواہاں ہے۔

'اگر ہم ہم عمر ہوتے تو میں اپنی بیوی کو چھوڑ دیتا۔ صرف تم کو اپنا لیتا۔ لیکن مجھے تم سے اتنی محبت ہے کہ میں تم سے یہ زیادتی نہیں کر سکتا کہ اپنے سے کچھ بڑے آدمی سے جڑ جاؤ۔'

'کچھ بڑے' میں نے طنزاً پوچھا۔

'عمر تو دل سے ہوتی ہے' احمر کی باتوں میں افسانوی سنجیدگی ہوتی تھی۔ پھر وہی ٹھہراؤ، وہی سنجیدگی کہ ایک بار تو گمان ہو جائے کہ شاید یہ سچ ہی بول رہا ہے۔ اتنی صفائی سے جھوٹ کیسے بول سکتا ہے۔ یا شاید دل وہی سن رہا تھا جو وہ سننا چاہتا تھا۔ یہ کس قسم کی مجبوری ہے کہ ہم ایسے رشتوں ایسی مصلحتوں میں بندھ جاتے ہیں، جنھیں ہم چاہنے کے باوجود توڑ نہیں پاتے۔

'یہ میری محبت ہی تو ہے کہ ہم نے کچھ حدیں پار نہیں کی ہیں۔'

'کیا مطلب؟'

'مطلب اس وقت سمجھو گی جب تم بڑی ہو جاؤ گی اور تمھاری شادی ہو جائے گی۔' میں تو بڑی اسی وقت ہو گئی تھی جب اس نے پہلی بار مجھے چوما تھا، اب کیا بڑا ہونا رہ گیا تھا۔

اب میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ ڈاکٹر محمود نے ٹشو اٹھا کر میرے ہاتھ میں تھما دیے، وہ ابھی تک درمیان میں کچھ نہیں بولے تھے۔

'آپ نے اپنے والد کو کچھ نہیں بتایا' ڈاکٹر محمود نے استفسار کیا۔

'ہمت ہی نہیں ہوئی۔'

'انھوں نے پوچھا نہیں یا آپ نے بتایا نہیں؟'

'جھوٹ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ کہ آدمی اس چیز کے بارے میں جھوٹ گھڑے جو ہوئی ہی نہیں ہو۔ اور دوسری قسم وہ جب کوئی عمل جو ہو چکا ہو اس کو دروغ کا لبادہ پہنایا جائے۔ میری صبح و شام ان دو جھوٹوں سے پُر تھی۔ میں ایک جھوٹی زندگی گزار رہی تھی۔ ابو نے پوچھا نہیں میں نے بتایا نہیں۔'

'آپ نے جو یہ دو قسم کے جھوٹ بیان کیے ہیں اگر ان میں سے ایک بولنا پڑے تو آپ کون سا بولنا پسند کریں گی؟' ڈاکٹر محمود نے دلچسپی سے پوچھا۔

'پتہ نہیں' میں گڑبڑا سی گئی۔' یہ کیا سوال ہوا۔ کبھی اس طرح سوچا ہی نہیں۔'

'خیر چھوڑیں اس بات کو جانے دیں، آپ اپنی بات جاری رکھیں۔'

میں ڈاکٹر محمود کے اس غیر متوقع حملے سے ابھی تک جانبر نہیں ہوسکی تھی۔ نہ جانے کیوں میرا انداز جارحانہ ہو گیا۔

'ڈاکٹر صاحب اگر آپ کو ایک جھوٹ بولنا پڑے، تو آپ کون سا بولیں گے۔'

'میں دونوں میں سے کوئی جھوٹ نہیں بولوں گا' ڈاکٹر محمود نے اعتماد سے کہا۔

'اگر جھوٹ سے کسی کی جان بچ رہی ہو تو؟'

'کس کی جان؟' ڈاکٹر محمود اب براہِ راست میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے نہ جانے میرے جوابات سے کیا پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرا پاؤں غلطی سے پھر ڈاکٹر محمود کے پاؤں پر پڑ گیا۔ میں بھول گئی کہ میں چپل اتار کر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے پیر ہٹایا نہیں۔ ڈاکٹر محمود جو میز پر رکھے پیڈ پر نوٹس لے رہے تھے، قلم پیڈ پر رکھ کر سیدھے بیٹھ گئے اور میری طرف دیکھنے لگے۔ ان کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ کسی بھی تاثر سے خالی، میں کچھ بھی نہ پڑھ سکی۔ میں نے اچانک میز پر آگے جھک کر ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔

'ڈاکٹر محمود مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ صرف آپ ہی مجھے میرا اعتماد اور میرا سکون واپس کر سکتے ہیں۔'

'میں پوری کوشش کروں گا' محمود نے ہاتھ چھڑایا نہ میرے پاؤں کے نیچے سے اپنا پیر ہٹایا۔

'میں کتنی ریزہ ریزہ ہوں، کوئی ایک سمجھ دار، محبت بھرا چہرہ، کوئی شخص جو مجھے سمجھ سکے'، میرے لہجے میں دنیا بھر کا دکھ تھا۔ بے دھیانی میں، میں نے انگوٹھے سے محمود کے ہاتھ کی پشت کو سہلانا شروع کر دیا۔ مجھے رونا آ گیا اور میں سسک پڑی۔ محمود میز کی دوسری سمت سے اٹھا اور مجھے گلے لگا کر تسلی دی۔

'ہمارے پیشے میں مریض کو گلے لگانا اور کسی بھی قسم کا ذہنی یا جذباتی تعلقِ خاطر سختی سے منع ہے۔ یوں سمجھیے یہ مکتب کا پہلا درس ہوتا ہے۔'

'محمود یوں کتابی علم سے ہر مرض کا علاج تو نہیں ہوسکتا۔ ڈاکٹری کے خول سے نکل کر تم کو

ذاتی، انسانی اور جذباتی سطح پر اتر کے بھی کبھی کبھی علاج کرنا پڑتا ہوگا؟'

اس سے پہلے کہ ریسپشنسٹ اندر آتی محمود واپس جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

'میرے خیال میں کسی بھی قسم کی جذباتی وابستگی مناسب نہیں ہے۔ میں آپ کو اپنے کسی اور ساتھی ڈاکٹر کے پاس بھیج دیتا ہوں۔'

'نہیں محمود مجھے یقین ہے تم مجھے اس منجھدار سے نکال لو گے۔ مجھے کسی اور کے پاس نہیں جانا۔تم میرے کسی کمزور لمحے سے فائدہ نہیں اٹھا رہے۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ ماضی کے کمزور لمحات تمھارے علاج سے میری شخصیت کی محرومی اور کمی کو پورا کریں گے یہاں میرے آنے کا مقصد بھی یہی ہے۔تم مجھے بالکل کسی اور کے پاس نہیں بھیج رہے۔' میرا لہجہ رو دینے والا تھا۔

'لیکن' صاف ظاہر تھا کہ محمود ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔ میرے طرزِ تخاطب میں تبدیلی اس نے محسوس کی تھی یا نہیں، اس کے انداز سے کچھ ظاہر نہیں تھا۔

'لیکن ویکن کچھ نہیں۔'

'اچھا ٹھیک ہے' محمود نے گویا ہتھیار ڈال دیے۔ 'لیکن اگلا سیشن تمھارا آخری ہونا چاہیے، میرے خیال میں ہم مسئلے کے حل کے قریب ہیں۔'

'بھئی محمود اگلا سیشن جب ختم ہو رہا ہوگا تب طے کریں گے کہ مزید کی ضرورت ہے یا نہیں' میں نے رسان سے اپنے طبیب کو سمجھایا۔

'چلو یہ ٹھیک ہے۔'

میں ریسپشنسٹ سے پھر ایک ہفتے بعد کا وقت لے کر چلی آئی۔ میرے ذہن میں پھر بہت اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ میں اپنی لگامیں کھینچنے اور سمت کی درستگی کے لیے بے چین تھی۔محمود کے لیے سوچتی رہی۔ کاش میرا ان سے ڈاکٹر اور مریض کا رشتہ نہیں ہوتا۔محمود کی شخصیت میں مقناطیسیت تھی۔ بات میں وقار، ذہانت، چہرے پر سنجیدگی اور ملائمت۔ میں بہت تیزی سے چند ہی دنوں میں اپنے آپ کو ڈاکٹر محمود سے بہت قریب سمجھنے لگی تھی، ایک ہفتہ کاٹنا مشکل ہو گیا۔

ایک ہفتہ بعد ایک بار پھر وہی میں تھی اور ڈاکٹر محمود کا دفتر۔ ریسپشنسٹ نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ اس دفعہ محمود نے گلے لگا کر میرا استقبال کیا تو میری بے قرار روح کو استقرار

ملا۔ میری کہانی میں اب باقی کیا رہ گیا تھا۔

''نتیجہ نکلا تو میرے نمبر بہت کم تھے' میں نے سلسلہ وہیں سے جوڑا جہاں ایک ہفتہ پہلے توڑا تھا۔'ابو نے مجھے بلا کر پیار سے نتیجے کے بارے میں پوچھا تو میں رو پڑی، منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں اپنے والد سے بہت قریب تھی۔ ہمارے تعلقات بہت دوستانہ تھے، نہ جانے کیوں اس موضوع پر میرا منہ گنگ رہتا۔ ابو نے نہ جانے میری شکل پر کیا دیکھا کہ مجھے امی کے پاس چھوڑ کر احمر عباسی سے ملنے جا پہنچے۔ جانے ان دونوں میں کیا بات ہوئی، کس قدر مشکل مرحلہ رہا ہوگا میرے ابو کے لیے۔ میرے ابو نے انتہائی بہادری کا ثبوت دیا جو احمر عباسی سے مار پیٹ نہیں کی۔ میں نے اپنا جو باپ دوبارہ دیکھا وہ بہت دلگیر، بہت ٹوٹا ہوا تھا، بہت شرمندہ تھا۔'

'بیٹا مجھے معاف کر دینا۔ ویسے تم کر بھی دو تو بھی شاید میں اپنے آپ کو معاف نہ کر سکوں۔ میں نے کیسے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اب ہم آئندہ اس موضوع پر بات نہیں کریں گے۔' لیکن آئندہ میں تمھیں کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ تم اکیلی ہی یہ جنگ لڑتی رہیں۔' انھوں نے آنکھیں ملائے بغیر مجھ سے بات کی۔ ابو کی ایک ماہ میں پروموشن ہونی تھی۔ لیکن انھوں نے اسے قربان کر کے ایک ہی ہفتہ میں وہاں سے تبادلہ لے لیا۔ اس کے بعد میرے اپنے باپ سے تعلقات کی نوعیت بدل گئی۔ انھوں نے میری چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھا، میں جہاں رہی روزانہ بلا ناغہ فون پر میری خیریت پوچھتے، لیکن ان کے رویے میں ایک شرمندگی کا عنصر عیاں رہتا۔ ایرفورس کا یہ افسر تو بہت ہمت اور برداشت کا مالک تھا، اس کی آنکھیں ساون بھادوں رہنے لگیں۔ اب وہ میرا پہلے سے بہت زیادہ خیال رکھتے مگر کبھی میرے پاس زیادہ دیر بیٹھ نہ پاتے۔'

'ہنہ' محمود نے ہنکارہ بھرا۔

'تم نے اس سلسلے میں کیا کیا، احمر عباسی کے گاؤں سے نکلنے کے بعد آپ نے خود کو کیسے سزا دی؟' محمود ابھی طے نہیں کر پایا تھا کہ مجھے کس انداز سے مخاطب کرے۔

'بس یوں سمجھو ابھی تک فارغ پھرتی ہوں، شادی نہیں کی۔ سوچوں پر پہرے بٹھا دیے ہیں۔ خالی الذہنی میرے لیے افیم کا کام کرتی ہے۔' میں اب کھلی آنکھوں سے رو رہی تھی۔ نگاہیں

ڈاکٹر محمود کی کرسی کے پیچھے دیوار پر کسی نکتے پر مرکوز تھیں، چہرے پر آنسو رواں رہے تھے۔

ڈاکٹر محمود نے ہاتھ سے ٹشو پیپر بڑھائے تو میں نے میز پر رکھ کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ محمود میز کے اس پار سے اٹھا اور مجھے لپٹا لیا۔

'وعدہ کریں محمود، مجھ سے ملتے رہیں گے۔ آپ سے مل کر وہ سب کچھ مل گیا جو میں نے ابھی تک کھویا ہوا تھا۔' میں نے ملتجی نگاہوں سے انھیں دیکھا اور پنجوں کے بل اٹھ کر ان کے لبوں پر اپنی پیشانی رکھ دی۔ محمود نے یکلخت مجھے لپٹا کر بھینچا، پھر میرے بالوں کو بوسہ دے کر کرسی پر بٹھا دیا۔ میرا وقت پھر ختم ہو رہا تھا۔ میں محمود سے شام کی چائے کا وعدہ لے کر ہی اٹھی۔

اس شام چائے ہم نے کلفٹن کے ایک خوبصورت فرانسیسی ریسٹورانٹ میں پی۔ ریسٹورانٹ کی فضا بہت دھیمی اور سکون آور تھی۔ میرا ذہن کسی سطح پر بہت مطمئن ہو چلا تھا۔ جب ہم اٹھے تو ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ تھا۔ ڈاکٹر محمود بھی غیر شادی شدہ تھے۔ بھرے پرے شہر میں اکیلے۔ اگلے دو ہفتوں میں ہم کم از کم چار بار ملے۔ سوائے لپٹا لینے، ہاتھ تھامنے اور بال چومنے کے محمود نے ابھی تک کوئی پیش قدمی نہیں کی تھی، شاید انھیں میری ذہنی کیفیت کا اندازہ تھا۔

پورے چاند کی راتیں مجھے بہت بھاتی ہیں۔ اتنی زیادہ چاندنی کہ ہر آدمی اپنے حصے کی ٹھنڈک اور روشنی لے لے۔ محمود بھی میری اس کمزوری سے واقف ہو گئے تھے۔ لہٰذا جب میں نے تجویز کیا کہ آج چودھویں کی رات ہے، کیوں نہ کلفٹن میں ساحلِ سمندر کے کنارے گزاریں تو انھیں قطعاً حیرت نہیں ہوئی۔

سمندر کی لہریں بہت شور مچا رہی تھیں۔ جیسے اچھل اچھل کر چاند کو چھو لینا چاہتی ہوں۔ ہم نے ایک نسبتاً ویران جگہ کار پارک کر کے شیشے نیچے اتار دیے۔ دور دور تک دوسرا کوئی نفس نہ تھا۔ چودھویں کی رات اپنا اثر دکھا رہی تھی، میرا موڈ بہت ہلکا بہت رومانٹک ہو رہا تھا۔ محمود کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے دھیرے سے گاڑی کا پلیئر آن کر دیا۔

چھو کر میرے من کو۔۔۔۔ جگجیت کی آواز میں غزل دو آتشہ ہو گئی۔

'کبھی سوچا بھی تھا کہ ہم یہاں تک پہنچ جائیں گے' میں نے محمود سے کہا۔

'نہیں اور خاص طور پر میں نے، میرا کردار تمھارے معالج کا تھا۔ تمھیں تو مجھ پر حرام

ہونا چاہیے۔' محمود ہنس کر بولا۔

'مجھے تو لگتا ہے تم اپنے سب ہی مریضوں کا ایسے ہی علاج کرتے ہو' میں نے چھیڑا۔

'پاگل ہو۔ مریضاؤں کے لیے تو ہم اندھے ہوتے ہیں۔ ان کا حسن ہمیں خیرہ نہیں کر سکتا۔' میں نے محمود کے کندھے پر اپنا سر دیا اور آنکھیں بند کر کے ہونٹ اوپر کر دیے۔ میرے ہاتھ سیٹوں کے درمیان کپ ہولڈر میں پڑے تو انگلیاں شاید چھوٹی الائچیوں سے ٹکرائیں۔

'یہ کیا ہے؟' میں اپنے خمار میں کچھ سوچ نہیں رہی تھی۔

'کبھی کبھی ایک آدھ سگریٹ پی لیتا ہوں، الائچی پھانکنے سے دوسروں کو میرے منہ کی بو برداشت نہیں کرنی پڑتی'، میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہہ پاتی محمود کی گرم سانسیں اپنے ہونٹوں پر محسوس ہوئیں تو چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ جیسے ہی محمود کے ہونٹ میرے ہونٹوں سے مس ہوئے، میں تڑپ کر ہٹی اور محمود کے گال پر ایک چانٹا جڑ دیا۔

'یہ کیا بکواس ہے' محمود کا ہاتھ بے ساختہ اپنے گال کو سہلانے لگا۔

'جب تمھیں مریضاؤں کے لیے اندھا ہونا ہوتا ہے تو تم نے یہ رنگین خواب دیکھنے کیسے شروع کر دیے۔ پیدائشی اندھا تو رنگین خواب دیکھ ہی نہیں سکتا۔'

'تم کیا کہہ رہی ہو میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا' محمود بہت الجھ رہا تھا۔ 'تم تو اتنی افسردہ تھیں اتنی غمزدہ؟'

'ہاں محمود بہت افسردہ، بہت غمزدہ، تم ہی مجھے بچا سکتے ہو' میں نے محمود کے پیچھے ایک نکتے پر نظریں جما کر کہا، میری آنکھوں سے آنسو ڈھلک رہے تھے۔ جیسے ہی محمود نے مجھے حیرت سے دیکھا میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

'احمر عباسی سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ احمر عباسی کے بعد مجھے بہت حسرت تھی کہ کسی جسم کے شمشان گھاٹ کی آگ اسی پر الٹ دوں۔ بھروسے کے پرخچے اس نے بھی اڑائے تھے اور تم نے بھی۔ لیکن آج جب میں نے نہیں کہنے کی ہمت کی ہے تو اس چانٹے سے میرا علاج ہو گیا ہے۔' میں نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور گاڑی سے اتر گئی۔

تعلقِ خاطر

اکلوتی بیٹی کی سالگرہ کتنا بڑا مرحلہ ہے یہ درد وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو صاحبِ استطاعت ہیں۔ غریب آدمی مرنے کے دن گنا کرتا ہے، اسے سالگرہ کا کیا خیال، ممکن ہو تو پیدائش کو بھول ہی جائے۔ میں ماشاء اللہ اپنی پیاری بیٹی حرا کی سال گرہ ہر سال بہت دھوم دھام سے مناتی ہوں۔ بھئی تقریب اگر گھر میں کرو تو بہت کھڑاگ ہوتا ہے، اسی لیے بہتر یہی ہے کہ کسی ہوٹل، ہال یا ریستورانٹ میں کر لی جائے۔ میں ایسی سستی جذباتیت کی قائل نہیں کہ بچے کا سارا کام اپنے ہی ہاتھوں سے کر کے خوشی ہوتی ہے۔ گھنٹوں کھڑے خود کیک بنا رہے ہیں۔ نہیں بھئی وقت کے وقت ہال میں پہنچ گئے۔ پھر ہال میں ذرا موسیقی کا انتظام بھی اچھا ہو جاتا ہے۔ اب حرا ماشاء اللہ چودہ برس کی ہوگئی ہے۔ امریکہ میں چودھویں سال گرہ بہت دھوم دھام کے ساتھ منائی جاتی ہے۔ عام سال گرہوں کے مقابلے میں اسے بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

'بھئی تمھاری موم بتیاں تو بلومنگ ڈیل پر بھی نہیں ملیں۔ اب کیا کریں؟ میں نے متفکرانہ حرا سے سوال کیا۔ میں، حرا اور اس کی بے بی سٹر جولی پچھلے دو گھنٹے سے ڈرائیور کے ساتھ حرا کی پسند کی تیرنے والی موم بتیاں ڈھونڈ رہے تھے۔ چھوٹی، گول موم بتیاں جلا دو تو پانی کے تسلے میں تیرتی بہت اچھی لگتی ہیں۔ میرے شوہر یہاں ایک پاکستانی بینک میں ایریا مینیجر

تھے۔ دفتر کے لیے ڈرائیور کی سہولت بھی موجود تھی۔ کار تو یہاں سب ہی کے پاس ہوتی ہے، شوفر اتر کر دروازہ کھولے تو فرق پتہ چلتا ہے۔ کار اور ڈرائیور کی یہ سہولت دفتر سے اکثر گھر تک پھیل جاتی تھی۔

'بیٹا کوئی اور سی موم بتی ڈھونڈ لو، ڈارلنگ؟' میں نے بہت پیار سے حرا کو سمجھایا۔

'نہیں مما، وہ موم بتیاں الزبتھ نے اپنی سالگرہ پر لگائی تھیں، اتنی خوبصورت لگ رہی تھیں۔ اب میری سالگرہ پر نہیں ہوں گی تو سب کیا سوچیں گے۔

یہ واقعی ایک مسئلہ ہے۔ ایک عالمی مسئلہ، سب کیا سوچیں گے۔ الزبتھ نے اپنی سالگرہ میں جو معیار مقرر کر دیا تھا ہم اس سے صرف اوپر کی جانب ہی جا سکتے تھے۔ اس نیچے خود ساختہ، خود فریبی کی ایک کھائی ہے جس میں گرنے کے ڈر سے ہم مہنگی اور مہنگی سیڑھیاں خریدتے رہتے ہیں۔

'میڈم، جیسی موم بتیاں حرا مانگ رہی ہے، ویسی ایک دکان میں ملتی ہیں جو مجھے معلوم ہے۔' حرا نے ذرا ہچکچاتے ہوا کہا۔

'ارے جولی تم پچھلے تین گھنٹوں سے ہمارے ساتھ پھر رہی ہو، پہلے کیوں نہیں بتایا' میں جولی پر الٹ پڑی۔ عجیب احمق بے بی سٹر ہے۔ یہ غریب اتنے بیوقوف کیوں ہوتے ہیں۔ بے وقوف نہ ہوتے تو غریب کیوں ہوتے۔ میں ان پر صرف افسوس کرنے کے علاوہ اور کیا کر سکتی ہوں ان کے لیے۔

'وہ دراصل' جولی ہچکچائی۔

'دراصل کیا، جلدی بتاؤ، خرم صاحب بھی گھر آنے والے ہوں گے' میں بدستور جولی سے ناراض تھی۔

'میڈم وہ ڈالر اسٹور میں بالکل ویسی ہی موم بتیاں دستیاب ہیں۔'

'ڈالر اسٹور میں' میں نے استہزائیہ انداز میں دہرایا۔

'چلیں مما ڈالر اسٹور سے لے لیتے ہیں۔'

'نہیں حرا، ڈالر اسٹور میں کیا خاک اچھی موم بتیاں ملیں گی۔ جہاں ہر چیز ایک ڈالر کی ہو وہاں اچھی چیز کیسے مل سکتی ہے۔' میں نے حرا کو سمجھایا۔

'لیکن مما صرف تھوڑی دیر کے لیے تو چاہیے ہے۔'

'تھوڑی دیر نہ زیادہ دیر۔ ڈالر اسٹور نہیں جا رہے۔' میں نے حرا کو سمجھایا۔

'لیکن کیوں مما' بچے ذرا بڑے ہو جائیں تو کیسی بات کی کھال نکالتے ہیں۔

'بیٹا میں ڈالر اسٹور کیسے جاؤں گی۔ کسی نے دکان کے اندر آتے جاتے دیکھ لیا تو کیا سوچے گا، ہم ڈالر اسٹور سے شاپنگ کرتے ہیں؟' میں نے جولی کو گھورا۔

'تمھیں کیسے پتہ کہ وہاں ملتی ہیں' میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ جولی کو کچا چبا جاؤں۔

'میڈم میری امی وہاں کام کرتی ہیں تو میں اکثر ان کے پاس جاتی ہوں۔ میں نے وہاں دیکھی ہیں۔'

'میں ڈالر اسٹور قطعاً نہیں جا رہی ہے۔ ابھی ایک ہفتہ ہے سالگرہ میں، کچھ دن اور ڈھونڈتے ہیں ان ڈیپارٹمنٹل اسٹوروں میں، اگر نہیں ملیں تو دیکھا جائے گا۔'

'یہ ٹھیک ہے، آپ لے آئیں گی ناں پھر' حرا خوش ہو گئی۔

'نہیں جولی جا کر اپنی ماں سے لے آئے گی۔ میں اس ڈالر اسٹور میں نہیں دیکھی جا سکتی۔ میرے حتمی لہجے نے بات ختم کر دی۔

گھر پہنچے تو خرم آ چکے تھے۔ خرم ایک کامیاب انوسٹمنٹ بینکر تھے۔ پیسے کی ہمیں کوئی کمی نہیں تھی۔ خرم میری ہر خواہش کہنے سے پہلے ہی پوری کر دیتے تھے۔ پیسے کے ساتھ ساتھ میری آرٹس اور لٹریچر سے دلچسپی بھی متوازی خطوط پر بڑھ رہی تھی۔ خرم بھی شہر کی کئی ادبی انجمنوں کی سرپرستی کرتے تھے۔ مجھے رنگ بہت بھاتے تھے اس لیے میں ایشین آرٹس ایسوسی ایشن کی صدر تھی۔ آج شام بھی ایسوسی ایشن کی میٹنگ تھی۔ کچھ نئی تصاویر پر شہر کے معروف نقاد تبصرہ کرنے والے تھے۔ میری موجودگی میں کسی دوسرے کی صدارت انجمن کو بہت مہنگی پڑ جاتی۔ پھر اخبار والے بھی دوسرے دن، میری موجودگی کی وجہ سے تقریب کو خبروں میں نمایاں جگہ دیتے تھے۔ اپنی جز وقتی ملازمہ سے خرم کو کھانے کا کہہ کر میں تیار ہونے چلی آئی۔ سچ تو یہ ہے کہ محفل کی نوعیت کے حساب سے تیار ہونا پڑتا ہے۔ مصوری کی تنقیدی نشست میں پتلون پر کوئی اچھی کڑھائی کا کرتا، بال کھلے چھوڑ دینا زیادہ مناسب ہے۔ گلے میں موتیوں کی صرف ایک لڑی

ڈال لی اور چھوٹے پرس کی جگہ ایک بڑا بیگ کندھے پر ڈال کر نیچے ہال میں اتر آئی۔ سادگی و پُرکاری، بے خودی و ہشیاری۔ ایسی جگہوں پر آدمی یا تو اپنی زبان سے دانشور لگے ورنہ کم از کم اپنے لباس سے۔ آج ایسوسی ایشن کا پروگرام یہ تھا کہ کچھ نامور مصوروں کی ایبسٹریکٹ تصاویر دکھا کر ان کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ اس نشست میں شہر کے دو تین مصوری کے نقاد مضمون پڑھتے اور آخر میں میرے صدارتی کلمات۔

میٹنگ ہال میں تقریباً ستائیس افراد موجود تھے۔ یہ خاصی حوصلہ افزا تعداد تھی کیونکہ اکثر تو صرف چھ یا سات شرکا پر ہی اکتفا ہوتا ہے۔ پہلی تصویر سامنے آئی تو مجھے بہت دلکش لگی۔ ایسا لگا جیسے مصور نے انتشار کو اپنے برش کا موضوع بنایا تھا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی جب ایک نقاد نے بھی اس تصویر میں یہی نکتہ دریافت کیا اس تصویر میں۔ دوسری تصویر بھی بہت خوبصورت تھی۔ رنگوں کا بہت حسین امتزاج تھا۔ بہت دلکش اور شوخ رنگ استعمال کیے تھے۔ اس کو بھی ایک نقاد نے اپنے مضمون میں خوب سراہا۔ مجھے یہ فائدہ حاصل ہے کہ سب سے آخر میں باری آتی ہے، اس وقت تک اِدھر اُدھر سے کافی نکات جمع ہو جاتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ اگلی تصویر پیش ہوتی ہمارے اعزازی سیکریٹری نے مائک سنبھال لیا۔ یہ شخص مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا ہے، بنا بنایا Pseudointellectual۔ مجھے یقین ہے آپ نے ایسے نقاد بارہا دیکھے ہوں گے۔

’خواتین و حضرات، یہ دونوں تصاویر جو آپ نے دیکھیں وہ پانچ سال کے ایک بچے نے رنگوں سے کھیلتے ہوئے کاغذ پر اتاری ہیں۔ اس کی ماں، جو میری پڑوسن ہے، انھیں باہر پھینکنے والی تھی کہ میں آج کی کارروائی کے لیے مانگ لایا۔ کیوں کہ ہم بہت ماہر مصوروں کے فن پاروں کی توقع کر رہے تھے لہٰذا ہم رنگوں کے ان فضول اور بے معنیٰ ملاپ میں ان فنکاروں کی جان کاری دیکھتے رہے۔ یہاں اس سے ہمارے معتبر ناقدین کا امتحان مقصود نہیں تھا بلکہ اس امر کو ثابت کرنا تھا کہ ہم اکثر وہ دیکھتے اور سنتے ہیں جو ہمارا لاشعور چاہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ صاحبِ صدر تو ان تصاویر کو دیکھ کر فوراً پہچان گئی ہوں گی‘، یہ کہہ کر اس نے میرا غصہ کچھ کم کیا۔

’یہ ایک فلسفیانہ نکتہ ثابت کرنے کی بھونڈی سی کوشش تھی‘ میں نے اپنے صدارتی کلمات شروع کیے۔ ’میں تو ظاہر ہے انھیں دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ یہ کسی ماہر فنکار کی کاوش نہیں اور ان

میں کوئی تقسیم نہیں ہے۔' میں نے اپنے کلمات مختصر رکھے، مجھے اعزازی سیکریٹری کی یہ حرکت بہت ناگوار گزری تھی۔

حرا کی سالگرہ بہت اچھی رہی۔ کتنی پیاری لگ رہی تھی میری گڑیا۔ موم بتیاں اور کہیں نہ ملیں تو جولی جا کر اپنی ماں کے اسٹور سے لے آئی۔ شکر ہے جولی کی سالگرہ اتوار کو ہو گئی تھی کہ پیر کا دن میری زندگی کا منحوس ترین دن ثابت ہوا۔

صبح کوئی ساڑھے دس بجے میرے پاس خرم کا بینک سے فون آیا، آواز میں گھبراہٹ اور پریشانی نمایاں تھی۔

'ڈارلنگ اسٹاک مارکیٹ بالکل بیٹھ گئی ہے، بڑی گڑبڑ ہے۔'

'بھئی بیٹھ گئی ہے تو اٹھ جائے گی۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ تم ہی تو کہتے ہو اسٹاک مارکیٹ کا کام ہی اٹھک بیٹھک ہے۔' میں نے ماحول کو ذرا ہلکا کرنے کی کوشش کی۔

'نہیں ڈارلنگ، تم نہیں سمجھو گی۔ میں نے تو بینک کا بہت بڑا سرمایہ اسٹاک مارکیٹ میں لگا دیا تھا، وہ سب ڈوب گیا۔ اسٹاک اتنی تیزی سے بڑھ رہے تھے کہ جلدی میں، میں نے اس کی اجازت بھی نہیں لی تھی۔ سوچا تھا جب بڑا منافع دکھاؤں گا تو اوپر والے کتنے خوش ہوں گے اور میری دور اندیشی کی داد دیں گے۔ یوں سمجھو بغیر اجازت کی انوسٹمنٹ سے بینک کا سارا پیسہ ڈبو دیا ہے۔ واہ واہی میں تو سب ساتھی ہوتے ہیں لیکن اب یہ سولی اکیلے میری گردن میں ڈال دی جائے گی۔' خرم کے لہجے میں بہت شکستگی اور مایوسی تھی۔

'خرم تم تو جنرل مینیجر ہو، جلدی بند کر کے آجانا، کہیں باہر جا کر کھانا کھائیں گے'، میرا ذہن ایک سیدھی لکیر کا تعاقب کرتا تھا۔

خرم کبھی گھر نہ آئے۔ ان کی لاش آگئی۔ اس حادثے کے سال بھر بعد بھی میں سوچتی ہوں کہ اس وقت میں خرم کے لہجے کی بے کسی سن لیتی تو شاید کچھ کر سکتی۔ بزدل، وہ اس ناگہانی سے ایسا گھبرایا کہ اپنی جان لے بیٹھا۔ اس کے ساتھ ہم بھی مر گئے۔ اس کی موت کا صدمہ تو شاید میں جی لیتی لیکن خرم کی قبل از وقت موت نے ہمیں کنگال کر دیا۔ انشورنس کمپنی سے ایک دھیلا نہیں ملا۔ کمبختوں نے کہیں سے بہت چھوٹے حروف میں درج یہ شق پالیسی میں ڈھونڈ نکالی

کہ خودکشی کی شکل میں ورثہ کو ایک پائی بھی نہیں ملے گی۔ خرم خود تو آسان راستے نکل لیے ہمیں جیتے جی مار گئے۔

چند ماہ کچھ پرانے زیور اور کچھ بچت سے کام چل گیا۔ میں نے رفتہ رفتہ اخراجات کو بہت کم کر لیا۔ اب گھر میں صرف وہ چیزیں آتیں جن کی اشد ضرورت ہوتی، وہ نہ آتیں جن کی خواہش ہوتی۔ پھر ضروریات بھی سکڑنے لگیں۔ ضروریات، خواہشوں میں ڈھلنے لگیں۔ خواب پہلے حسرت بنے پھر لطیفے بن گئے۔ یہ بہت تکلیف دہ دور تھا۔ اگر آپ لوڈو کے کھیل سے واقف ہیں تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ گوٹ کتنی آسانی سے اوپر کی سیڑھیاں چڑھتی ہے اور کھلاڑی کے لیے کتنا پُرمزہ لطف انگیز ہوتا ہے اس کا یہ سفر۔ مگر جب یہی گوٹ کسی عفریت کے خانے میں پہنچ جائے تو دھم کی آواز کے ساتھ نیچے آ گرتی ہے، یہ چوٹ صرف جسمانی ہی نہیں ہوتی۔ ہم نے چادر پھیلانا تو سیکھ لیا تھا، اسے سمیٹ کر، تہہ کر کے ایک طرف رکھ دینا، یہ سبق بہت دشوار تھا۔

گھر اونے پونے بک گیا۔ اس میں سے بھی آدھے سے زیادہ پیسے بینک کے قرضے میں نکل گئے۔ جو بچ رہے ان سے ایک کمرے کا اپارٹمنٹ لے لیا۔ جولی جانا نہیں چاہتی تھی مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے بہت ساتھ دیا۔ تھوڑا تھوڑا کر کے، جب ضرورت پڑی جولی کے ہاتھوں اپنا زیور بھی بکوا دیا۔ ابھی تک میری نوکری کی تلاش زیادہ امید افزا یا کامیاب نہیں رہی تھی۔ جس ایشین آرٹس ایسوسی ایشن کی میں صدر تھی انُ پر بھی اچانک انکشاف ہوا کہ میرا ذوقِ مصوری اتنا پختہ نہیں ہے اور رنگ اور کینوس کے بارے میں میری معلومات بھی بہت ناقص ہیں۔ دیکھنا چاہیے کہ 'سچ' غربت میں زیادہ بولا جاتا ہے یا امارت کا طرزِ تکلم ہے۔ میرے خیال میں تو غربت انسانی حوصلے، ارتقا اور ترقی کے لیے ایندھن ہے، کہ یہ اپنے موجودہ حالات اور اس کی کشاکش سے بلند ہونے اور اوپر اٹھنے کی ترغیب دیتا ہے۔

جولی اب مجھے اتنی کم عقل و بے وقوف نہیں لگتی تھی۔ اس نے میرا اس مشکل دور میں بہت ساتھ دیا۔ لیکن درجنوں درخواستوں کے باوجود انٹرویو تک کی نوبت نہ آئی۔ میرے پلے میں کسی قسم کا ہنر تھا ہی نہیں سوائے ایک بینکر کی خوش شکل بیوی ہونے کے۔ اس کو پہلے کبھی نوکری

کی ضرورت پڑی ہی نہیں تھی۔نوکری اب شوق یا ضرورت نہیں تھی، زندہ رہنے کا سہارا تھی، روز مرہ کے اخراجات کا مطالبہ تھی۔ایک روز جولی اپنی ماں کا پیغام لائی کہ ڈالر اسٹور میں ایک جگہ خالی ہے اور اگر میں اس نوکری کے لیے سنجیدہ ہوں تو وہ سفارش کر سکتی ہے۔

'ڈالر اسٹور میں نوکری' سنڈریلا اپنی سنہری سینڈل میں پاؤں الجھنے سے گر پڑی۔ اس کی ذات کے اطراف میں سارے فرضی تحفظات وقت کی تمازت سے ایسے پگھل گئے جیسے برف کے بنے ہوں۔

'کر لوں گی ڈالر اسٹور میں نوکری، کتنے پیسے دیں گے'، یہ کہنا مجھے کچھ اتنا مشکل بھی نہ لگا، وقت نے میرے لیے نئی لغت مرتب کر دی تھی۔

جولی جو یہ خبر دے کر نیچے زمین کی طرف دیکھ رہی تھی، اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

'مجھے آپ سے یہی امید تھی' اس نے میرا ہاتھ چوم لیا۔

'ڈالر اسٹور میں بھی تو سب انسان ہی کام کرتے ہیں۔ میرے جیسے جیتے جاگتے، گوشت پوست کے انسان، اور پھر ذرا سوچو وہ کتنے لوگوں کی ضروریات پوری کرتے ہیں، جو اس سے زیادہ مہنگی دکانوں میں خریداری نہیں کر سکتے۔'

اس سے پہلے کہ جولی کوئی جواب دیتی حرا کمرے میں داخل ہوئی۔

'حرا امی کو نوکری مل گئی' جولی نے اسے لپٹا کر کہا۔

'واقعی، امی کہاں نوکری شروع کر رہی ہیں آپ' حرا جولی سے الگ ہو کر مجھ سے آ لپٹی۔

'بیٹا ڈالر اسٹور میں' میری آواز میں بلا ضرورت مضبوطی عود کر آئی۔ ذہن میں ایک موہوم سی امید کہ حرا چند ماہ پہلے کی گفتگو بھول چکی ہو۔ حرا منہ سے کچھ نہ بولی، نہ جانے کیوں مجھے چھوڑ کر کمرے سے روتی ہوئی باہر نکل گئی۔ میں ابھی تک اسے بچہ سمجھتی تھی اس ایک لمحے میں اپنی ذہنی پختگی کا اندازہ کروا گئی، پگلی۔

میں اپنی بہترین جیکٹ اور پتلون پہن کر ڈالر اسٹور جا پہنچی۔ ہر قسم کے بندے، ہار موتی تو رفتہ رفتہ بک ہی چکے تھے ہلکی سی لپ اسٹک ہونٹوں پر پھیر لی۔ میں اسٹور کے باقی ملازمین میں آسانی سے کھپ گئی۔ جولی کی ماں نے بہت تپاک سے استقبال کیا۔ مجھے کام سمجھا کر کاؤنٹر پر کھڑا

کر دیا اور خود غائب۔ چند لمحے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ پہلا گاہک حاضر تھا۔ اسے چاہیے بھی کیا تھا، وہی سالگرہ کی تیرنے والی موم بتیاں۔ میں نے ایک لفافے میں ڈال کر گاہک کو پکڑا دیں:

'بہت اچھی موم بتیاں ہیں، بہت عمدہ انتخاب ہے آپ کا' آواز تو میری تھی مکالمہ اجنبی تھا۔ نہ جانے آنکھ میں کیا پڑ گیا کہ ہاتھ کی پشت سے آنکھوں کو پوچھا اور Next کہہ کر اگلے گاہک کو دعوت دی۔ سامنے لگے آئینہ پر نظر پڑی تو جولی کی ماں ایک آڑ سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ نظریں ملیں تو اس نے انگوٹھا اٹھا کر مجھے داد دی۔ پھر تو ہاتھ ایسا رواں ہوا کہ لگتا تھا میرا خمیر گندھا ہی اس کام کے لیے تھا۔ ملازم کی ضرورت سخت ہو تو مالک کی لاٹری نکل آتی ہے۔

شام ڈھلے آٹھ گھنٹے کی شفٹ ختم ہوئی تو باہر نکلے۔ جولی کی ماں جو نہ جانے کتنے سالوں سے جان فشانی سے یہ کام کر رہی تھی اس نے لپٹا کر ایسے داد دی کہ مجھے اپنے آپ سے شرم آگئی۔ میں بھی یہ مرحلہ طے ہو جانے پر خوش تھی۔ اب انتظار یہ تھا کہ کیسے یہ ہفتہ گزرے اور پہلی تنخواہ ہاتھ میں آئے۔ زندگی پھر رواں ہوگئی، گو اب یہ سفر فرسٹ کلاس کی جگہ اکنامی میں طے ہونے لگا، منزل بہر حال وہی رہی۔

یہ غالباً ملازمت پر میرا دوسرا ہفتہ تھا جب میری نظر اس ہار پر پڑی۔ نقلی موتیوں کا یہ ہار اصل سے بہتر تھا۔ اس کی تراش پر سے نظر نہیں ہٹتی تھی۔ بغیر کسی جوہری کی نظر کے یہ بتانا ناممکن تھا کہ یہ بے قیمت چند ڈالر کے موتی ہیں۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا تو شام ہونے تک ہار خرید کر گلے میں ڈال لیا۔ بہت عرصے بعد کوئی 'زیور' پہننا نصیب ہوا تھا، کیا ہوا اگر نقلی تھا۔ جولی کی ماں اور میں اب تک قریبی دوست بن چکے تھے۔ وہ بھی سامان شیلف میں لگا کر کاؤنٹر کے پاس سے گزری تو میرا ہار سراہے بنا نہ رہ سکی۔ سورج ڈھلنے کے ساتھ آج کا دن بھی ختم ہوا۔ میں جولی کی ماں کے ساتھ اسٹور سے باہر نکلی۔ ہمارا اسٹور اسی پلازہ میں تھا جہاں بلومینگ ڈیل تھا۔ خرم کی وفات کے بعد بلومینگ ڈیل جیسی مہنگی دکان میں جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ باہر ہی بیگم صباحت مل گئیں، بہت سارے گلے، شکوے، سوال اور جواب:

'کہاں ہو فون تک نہیں کیا، خرم کے بغیر کیسے ایڈجسٹ کر رہی ہو؟'

ہم دونوں لایعنی باتیں کر رہے تھے، جولی کی ماں ایک قدم پیچھے کھڑی ہماری بات ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔

'کس قدر نازک اور حسین ہار ہے' مسز صباحت نے داہنے ہاتھ سے میری گردن میں پڑے نقلی موتیوں کے ہار کو چھوا۔

'کہاں سے لیا یہ تم نے۔ تم ہمیشہ ایسی اچھی جیولری پہنتی ہو کہ دوسرا مارے حسد کے جل کر راکھ ہی ہو جائے۔' انھوں نے خوشدلی سے کہا۔

'ارے کہاں مسز صباحت یہ تو۔۔'

'ہاں بھلا پانچ ہزار ڈالر سے کیا کم ہوگا' مسز صباحت نے بے چینی سے میری بات کاٹی۔

میرا منہ سرخی مائل رنگت اختیار کر رہا تھا۔ میرا منہ آدھا کھلا دیکھ کر جولی کی ماں میری مدد کو آ کودی۔

'ہاں کس قدر خوبصورت ہار ہے، مجھے بتایا تھا انھوں نے کہ یہ لندن میں Harrods سے لیا تھا چار ہزار پونڈ کا، وہ بھی سیل پر' جولی کی ماں میرے چہرے پر بکھری حیرت کو نظر انداز کر کے بہت سنجیدگی سے بولی۔

'آہا، دیکھو میں پہچان بھی نہ سکی۔ حالانکہ صاف ظاہر ہے کہ Harrods کی چیز ہے، قیمتی ہے تو لیکن بھئی اچھی چیز تو قیمتی ہوتی ہے' مسز صباحت اتنا اچھا ہار نہ پہچان سکنے پر افسوس کرتی آگے بڑھ گئیں۔

ذرا ان کی سماعت سے دور ہوئے تو میں نے مصنوعی سنجیدگی سے جولی کی ماں سے پوچھا؛

'آپ نے ناحق انھیں دھوکے میں رکھا، کیا حرج تھا کہ بتا دیتیں کہاں سے لیا ہے؟'

'بھئی شے کی قیمت اس کے مالک کی حیثیت سے وابستہ ہوتی ہے۔ ہار سستا سہی لیکن آپ کی گردن میں چار ہزار پونڈ کا لگ رہا ہے کہ مسز صباحت آپ کو اس سے کم قیمت ہار میں دیکھنا سوچ ہی نہیں سکتی تھیں، قیمت چیز کی نہیں بلکہ اس کے حوالے اور وابستگی کی ہے' جولی کی ماں تو یہ کہہ کر چل دی، مجھے اپنی انجمن کے اعزازی سیکریٹری یاد آ گئے۔ میں اس اچنبھے میں پڑ گئی کہ اب تک کیا میری قیمت صرف خرم کے ساتھ وابستگی کی وجہ سے تھی؟

تنہائی کا سفر

آخر کار طلاق ہو ہی گئی۔

جس نے سنا افسوس کیا، ابھی تین ہی سال پہلے کس دھوم دھام سے شادی ہوئی تھی۔ سمیرا والدین کی اکلوتی بیٹی تھی، فقط چھ برس کی تھی کہ والدین امریکہ چلے آئے۔ یہ خاندان پردیس تو چلا آیا لیکن پاکستان سے ناطہ نہ توڑ سکا۔ ہر سال پلٹ کے جاتے رہے۔ کبھی کسی عزیز سے ملنے کے بہانے، کبھی خریداری کے شوق میں اور جس سال کوئی وجہ نہ بن سکی اس سال بس یہ کہ 'بھئی بہت دن ہوگئے پاکستان کا چکر لگائے۔' یوں سمیرا پلی بڑھی تو امریکہ میں لیکن پاکستانی روایت، ثقافت اور معاشرت سے اس کا قریبی تعلق رہا۔ امریکہ میں بھی ان کے سب ہی دوست پاکستانی تھے، یا کچھ ہندوستانی مسلمان خاندانوں سے میل ملاپ تھا۔ سمیرا ایک قدرتی استانی تھی۔ اکثر اوقات فطری رجحان اور طبیعت کا میلان نوعمری میں ہی ظاہر ہو جاتا ہے۔ انسان اپنی میلانِ طبیعت کے مطابق شعبہ اپنا لے تو بہت آگے نکل جانے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ بچوں کو پڑھانے کا سمیرا کو ہمیشہ سے شوق تھا۔ شاید اکلوتی اولاد ہونے کے ناطے، اپنے بچپن کا اکیلا پن وہ دوسرے بچوں سے گھل مل کر پورا کرتی تھی۔

ابھی گریجویشن مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ والدین کو اس کی شادی کا خلجان ہونے لگا۔ ایسے

میں جب اس کے والد کے دوست نے لاہور سے اپنے بیٹے کا رشتہ دیا تو معاملات خود بخود بنتے چلے گئے۔ ثمیرا لڑکے سے پاکستان میں کئی دفعہ مل چکی تھی۔ کنگ ایڈورڈ کالج میں میڈیکل کا سال آخر کا طالبِ علم۔ تیسری دنیا کے اکثر نوجوانوں کی طرح مغرب سے زیادہ مغرب زدہ۔ وہ مغربی موسیقی جو ثمیرا نے بھی نہ سنی ہو وہ اس کی زبان پر رہتی۔ امریکی فلمیں، لباس، فیشن، سیاست کون سی چیز تھی جو اخبار، ٹی وی اور میگزین کے ذریعے اطہر تک نہ پہنچی ہو۔ ثمیرا کے یہ اندیشے کہ مشرق کی یہ بیل مغربی مٹی میں کیسے پنپ سکے گی، اطہر سے مل کر اور باتیں کر کے ختم ہو گئے۔ امریکہ میں پلی بڑھی یہ 'دیسی' نسل ABCD یعنی American Born Confused Desi کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ انتقاماً یہ نوجوان نسل تازہ واردان کو FOB یا Fresh Off Boat کے نام سے چھیڑتے ہیں۔ ABCD اور FOB کا ملاپ عموماً ٹریجک ہوتا ہے، لیکن کامیاب وارداتیں بھی ایسی کچھ کم نہیں ہیں۔ حروف کے اختلاط میں زیادہ شرح ناکامیاب جملوں اور نامقبول اصطلاحوں کی ہے۔

اطہر اور ثمیرا کی عمروں میں صرف دو سال کی چھٹائی بڑائی تھی۔ دونوں خاندان ایک دوسرے سے خوب واقف تھے۔ لگتا تھا قدرت سہولتیں پیدا کرنے پر کمر بستہ ہے اور یہ جوڑی بنانے پر تلی ہے۔ پھر رخنہ کیا پڑسکتا تھا۔ یہ الگ بات کہ یہ سہولتیں اکثر اس لیے دی جاتی ہیں اسٹیج سیٹ ہو جائے تو پردہ اٹھے۔ دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ رخصتی کی تقریب لاہور میں۔ امریکی ڈالر جب روپے کی قوتِ خرید میں بدلے تو آرائش و جمال سستی ہو جاتی ہے۔ رنگ و خوشبو کے دہانے کھل گئے۔ کھانے پر اتنے لوازمات کہ بایزید کا دسترخوان شرما جائے۔ مقابلہ بازی کی اس فضا میں اس شان و شوکت اور دکھاوے سے ان بچوں کے والدین مشکل میں پڑ جاتے ہیں جن کی ابھی شادیاں نہیں ہوئی ہیں۔

نکاح اور رخصتی کے بعد ثمیرا کے والدین واپس ہیوسٹن آ گئے۔ جب کہ ثمیرا تقریباً چھ ماہ مزید پاکستان میں رکی۔ ان چھ ماہ میں اس نے بہت سے دوست بنا لیے۔ لاہور میں اس کے ہم عمر اس کی صاف گوئی، سادہ دلی اور خوش دلی سے بہت متاثر تھے۔ ثمیرا نے امریکی معاشرے کے اچھے موتی چن لیے تھے، جبکہ گندگی سے اپنا دامن بچائے رکھا تھا۔ چھ ماہ بعد اطہر اور ثمیرا

ہیوسٹن آئے تو یہاں بھی ایک شاندار تقریب میں اطہر کو ہیوسٹن کی پاکستانی کمیونٹی سے متعارف کرایا گیا۔

'ہیلو تابندہ کیا کر رہی ہو۔'

'سمیرا، فرصت مل گئی تمھیں۔ مجھے کیا کرنا ہے، لانڈری کر کے کپڑے تہہ کر رہی ہوں۔'

'میں سوچ رہی ہوں تمھاری طرف چکر لگا لوں۔'

'ارے واقعی، سچ، فوراً آجاؤ۔ یہاں صابری نہاری کی نئی دکان کھلی ہے، تمھیں اس کی نہاری کھلاؤں گی۔'

تابندہ کو میری کمزوری کا پتہ تھا، اس نے بالکل صحیح بٹن دبایا۔

'آ تو جاؤں لیکن تم اپنے اس 'doggy' کو فوراً باندھ لو پہلے۔' آپ سے کیا چھپانا، کتوں سے میری جان جاتی ہے۔

'Doggy' تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے doggy نہ ہو کوئی کتا ہو؟'

'کتا ہی تو ہے کمبخت، کتا، کتا، کتا۔'

'تم میری feelings بہت Hurt کر رہی ہو' تابندہ نے مصنوعی غصے سے کہا۔

'واقعی لاڈ تو تم اس کے ایسے اٹھاتی ہو کہ کیا میں اطہر کے اٹھا سکتی ہوں۔'

'تم فوراً آؤ۔ کتے کو کر دیا میں نے بند۔ مجھے سب سننا ہے شادی شدہ زندگی کے بارے میں۔'

اطہر کو ریزیڈنسی نیویارک میں ملی تو وہ دونوں نیو یارک کے علاقے بروکلین میں منتقل ہوگئے۔ سمیرا کو بھی یہاں ایک مقامی اسکول میں آرام سے نوکری مل گئی۔ نوجوان جوڑا اپنی مصروف زندگیوں کے درمیان ایک دوسرے کو سمجھنے اور پرکھنے میں مصروف ہوگیا۔ شادی بھی تو ایک سائنس ہے۔ جس میں تاریخ، جغرافیہ، معاشرتی علوم، کیمسٹری سب کے پرچے ہوتے ہیں۔ کسی پرچے میں ایک ساتھی فیل ہوتا ہے تو کسی اور پرچے میں دوسرا۔ اس طرح ایک دوسرے کی کمی بیشیوں کا حساب کر کے ایک توازن قائم ہو جاتا ہے۔ پہلے چھ ماہ اسی کرید اور دریافت میں

گزر گئے۔ سمیرا اور اطہر کے یہاں بھی بہت سے ہم عمر دوست بن گئے۔ دونوں ہی اس شہر میں اجنبی تھے۔ کچھ دوست اطہر کے حوالے سے بنے اور کچھ سمیرا کے تعلق سے جڑے۔ شومئی قسمت تابندہ بھی شادی ہوکر نیو یارک آ گئی تو زندگی اور رواں ہوگئی۔

ایک سال تک تو موسمِ بہار رہا پھر آہستہ آہستہ پروائی چلنے لگی۔ پہلے جھگڑے چھوٹی موٹی باتوں پر ہوتے تھے۔ اطہر گھر آیا ہے تو کھانا تیار کیوں نہیں۔ اگر سمیرا ابھی نوکری سے آئی ہے تو اسے صبح کھانا پکا کر جانا چاہیے تھا۔ پاکستان میں بھی لڑکیاں نوکری کرتی ہیں، لیکن ایسا تو نہیں ہوتا کہ ہانڈیاں اوندھی دھری ہوں۔ سمیرا سب کی موجودگی میں اگر اطہر سے گھر کے کام میں ہاتھ بٹانے کو کہتی تو یہ بات بھی وجہ نزاع بنتی۔ یہ چھوٹی چھوٹی چپقلشیں آہستہ آہستہ پھیل کر جنگوں میں بدل گئیں۔ دو نوجوان روحیں جو اب تک آزاد تھیں وہ ایک دوسرے کی پسند ناپسند کے حساب، معمولات اور طریقِ زندگی میں مقید ہونے کو تیار نہیں تھیں۔ اگر شروع میں بزرگوں کا سایہ سر پر ہوتا ہے تو اکثر مروّت اور محبت سے یہ گاڑی دھکم پیل سے چل پڑتی ہے، جہاں رکی والدین کے دباؤ اور مشورہ کے دھکے سے دوبارہ اسٹارٹ۔ مگر یہاں تو دو انا پسند ذاتیں اپنے اپنے گرد دائرہ بنا کر بیٹھ گئی تھیں۔ جس طرح جوڑے اپنی ذات کی نوکیں اور خار قربت کی خراد پر چڑھا کر ان کا زہر نکال لیتے ہیں، وہ نوکیں نہ جھڑ سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے ہی سال جوتوں میں دال بٹنے لگی۔

گو بات ابھی تک والدین سے پوشیدہ تھی مگر جیسے جیسے کشیدگی بڑھی یہ ناگزیر تھا کہ یہ ابال بھاپ بن کر ریاکاری کے ڈھکنے کو اڑا دے گا اور یہ کشمکش ابل کر دونوں خاندانوں کو آبلہ دار کردے گی۔ ہُوا بھی یہی۔ دونوں کے والدین کی بھرپور کوشش کے باوجود بات نہ پنپ سکی۔ مہینہ دو مہینہ کے لیے معمولات سنور بھی جاتے تو کسی بہت چھوٹی سی بات کی وجہ سے واپس اسی ڈگر پر آجاتے۔ خانگی جھگڑوں میں جب فریقین ایک دوسرے کی نظر میں عزت کھو دیں تو واپسی کا راستہ بند ہوجاتا ہے۔ پھر ایک دن جب یہ جھگڑا ہاتھا پائی میں بدل گیا تو یہ تابوت میں آخری کیل تھی۔ اب تک یہ بات سب دوستوں کو معلوم ہوچکی تھی۔ کچھ دوستوں نے درمیان میں پڑ کر صلح صفائی کی کوشش بھی کی مگر ناکام رہے۔ جس روز طلاق کا فیصلہ ہوا ہے وہ دن سمیرا کو اچھی

طرح یاد تھا:

'میرے والدین شام میں آرہے ہیں' میں نے صبح ناشتے کی میز پر اطہر کو اطلاع دی۔

'ابھی پچھلے ماہ تو ہو کر گئے ہیں۔'

'تو کیا اب اپنی بیٹی کے گھر آنے کے لیے مناسب وقفہ دے کر آئیں' میں اپنے لہجے میں طنز نہ چھپا سکی۔

'ہاں اگر یہ دورے جلدی جلدی ہونے لگیں تو۔ ایک تو ہمارے وسائل پر بوجھ پڑتا ہے مہمان داری کا، دوسرے میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ میں مصنوعی مسکراہٹ لیے ان کے سامنے بیٹھا رہوں۔'

'وہ تم سے ملنے تو نہیں آرہے' میں غلط فقرہ کہہ بیٹھی۔

'چلو اچھا کیا تم نے یہ واضح کر دیا۔ پھر میں آج رات وہیں ابراہیم کے پاس ٹھہر جاؤں گا۔'

'تم بالکل ابراہیم کے پاس نہیں سوگے۔ وہ لوگ کیا سوچیں گے' میں نے التجا کی۔

'مجھے ان کی آمد و رفت پر کنٹرول نہیں اپنی حرکت و سکونت کا تو اختیار ہے۔'

'پلیز ہمارے گھر کوئی بات درست کیوں نہیں ہوتی' اب میں آنسو نہ روک سکی۔

'یہ مگر مچھ کے آنسو مت بہاؤ۔ میں نے کہہ دیا میں رات نہیں آوں گا۔'

'بھاڑ میں جاؤ مجھے بھی غصہ آ گیا۔'

'بکواس کی ضرورت نہیں ہے اپنی زبان پر قابو رکھو ورنہ۔۔'

'ورنہ کیا؟' میں نے اطہر کو گویا چیلنج کیا۔

اطہر نے کوئی جواب نہیں دیا، صرف خونی نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔

گھر میں تناؤ کی وہ فضا قائم تھی کہ اتنی معمولی معمولی بات بھی نوکِ خار بن جاتی تھی۔ ہم دونوں بیوقوفوں کی طرح اس الجھے دامن کو سلجھانے کے بجائے جھٹکا دے کر نکالنا چاہتے تھے۔

'ورنہ کیا، بول کیوں نہیں رہے، یہ پاکستان نہیں ہے' میں نے سن رکھا تھا کہ پاکستان میں اکثر شوہر بیویوں پر ہاتھ اٹھا دیتے ہیں۔

'ورنہ یہ کہ ایک تھپڑ لگا تو تمھاری زبان تمیز کے دائرے میں پہنچ جائے گی۔'

'تھپڑ مارو گے، تھپڑ مارو گے'، میں نے اس کا گریبان کھینچا۔ 'میرے تو ہاتھ ٹوٹے ہوئے ہیں ناں۔'

اطہر نے مجھے دھکا دیا تو میں کرسی سے جا ٹکرائی۔ اب مجھ پر تقریباً ہسٹیریا کا دورہ پڑ چکا تھا۔ میں نے اپنی آواز سنی 'مار دو مجھے، جان سے مار دو، یہی کسر رہ گئی ہے۔'

'میں کیوں مار دوں، خود کیوں نہیں مر جاتیں۔ بہت سی لڑکیاں خودکشی کر لیتی ہیں، زہر کھا لیتی ہیں، کلائیاں کاٹ لیتی ہیں، مرنے کا شوق ہے تو وہ راستہ اختیار کرو' یہ میرا شوہر بول رہا تھا۔

'میں حرام موت گلے لگا لوں، مر جاؤں گی لیکن خودکشی کبھی نہ کروں گی۔ خودکشی نہ صرف حرام ہے بلکہ میرے نزدیک بزدلی کی سب سے نچلی منزل ہے، اور میں بزدل نہیں ہوں' میں نہ جانے کیا کیا کہتی رہی لیکن اطہر باہر جا چکا تھا۔

اس دن شام میں حمیرا کے والدین ہیوسٹن سے نیویارک پہنچے۔ حالات کی سنگینی کا اندازہ تھا، لیکن اب مرض لاعلاج پایا۔ تمام حالات کی تفصیل جان کر انھوں نے سمیرا کو طلاق کی اجازت دے دی۔

آج طلاق کو تین دن ہو چکے تھے۔

ان تین دنوں میں پچھلے تین سال کئی بار سمیرا کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے۔ اپنے رویے اور ذمہ داریوں کا محاسبہ۔ شاید یوں ہوتا تو یوں رہتا۔ میں یہ کرتی تو وہ یہ کرتا وغیرہ۔ لیکن پچھلے تین سال خاص کر پچھلا ایک سال ایک ایسا جہنم تھا کہ سمیرا کے ذہن میں کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ رستہ زخم ناسور بن کر پورے بدن میں زہر پھیلا دے، بہتر ہے کہ عملِ جراحی سے عضو ہی کاٹ دیا جائے۔ نیویارک اسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ والدین کے اصرار کے باوجود وہ ہیوسٹن واپس جانے کو تیار نہ تھی، جہاں اس کے بچپن کے سارے دوست اسے نیویارک رخصت کر چکے تھے۔ ہیوسٹن واپسی گویا ناکامی کا اعتراف ہوتی۔ وہ سرِ عام اپنے جاننے والوں کے درمیان اعترافِ ناکامی کا حوصلہ نہیں پا رہی تھی۔

سمیرا نے اسکول سے چھ ماہ کی رخصت لی اور پاکستان جا کر پڑھانے کی ٹھانی۔ منظر میں تبدیلی کی خواہش اتنی شدید تھی کہ والدین کے سمجھانے کے باوجود وہ کراچی چلی آئی۔ کراچی

اس کے لیے اجنبی نہیں تھا، والدین یہیں سے امریکہ گئے تھے، اور سمیرا تقریباً ہر سال یہاں آتی رہتی تھی۔ سمیرا نے کراچی میں کئی جگہ پڑھانے کے لیے درخواست ڈالی تو بہت اچھا اور حوصلہ افزا جواب ملا۔ کئی جگہ انٹرویو میں شریک ہوئی۔

'یہ بتایئے نیویارک چھوڑ کر آپ یہاں کیوں پڑھانا چاہتی ہیں۔'

'بس منظر کی تبدیلی کی خواہش یہاں کھینچ لائی۔ پھر یہ کہ جو کچھ وہاں سیکھا ہے وہ یہاں اپنے لوگوں کو لوٹا سکوں تو کتنا اچھا رہے۔'

'آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں؟'

'جی میں اکیلی ہوں۔ دراصل میری شوہر سے علیحدگی ہو چکی ہے' ہر انٹرویو میں یہ سوال جواب ضرور ہوتا۔ اسے اچانک امریکہ یاد آتا کہ جہاں انٹرویو میں یہ سوال غیر قانونی ہوتا۔

'اوہ!'

'کیوں کوئی مسئلہ ہے کیا' پہلے انٹرویو میں اس اوہ سے وہ ذرا گھبرا گئی تھی۔

'نہیں یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ میرا مطلب ہے آپ کو کوئی رکاوٹیں نہیں ہیں، بندھن نہیں ہیں تو آپ دل لگا کر کام کرسکتی ہیں۔'

نہ جانے کیوں سمیرا کو فوراً نوکری مل جاتی۔ لیکن پاکستان میں تین ماہ قیام میں اس نے چار نوکریاں بدلیں۔

'سمیرا بیٹا کیسا چل رہا ہے تمھارا کام' ایک دن امی فون پر پوچھ بیٹھیں۔

'امی کام تو ٹھیک ہے لیکن میرے خیال میں یہ تجربہ ناکام رہے گا۔ اور مجھے واپس نیویارک جانا پڑے گا۔' میں امی سے ہمیشہ بہت قریب رہی تھی۔

'کیوں بٹی کیا پیسے کم ہیں، میں تمھارے ابو سے کہوں بھیج دیں؟'

'امی پیسوں کی بات نہیں، اب مجھے طلاق شدہ اور اکیلا سمجھ کر سب کے رویے بدل جاتے ہیں۔' میں امی سے تفصیل بیان نہ کرسکی، لیکن مجھے یقین تھا وہ سمجھ جائیں گی۔

'کیا مطلب سمیرا' پھر بھی انھوں نے سوال کر ہی ڈالا۔ بعض جملے سن کر اور اہم ہوجاتے ہیں۔

'ارے امی چند ہی دنوں میں میرے ساتھی مرد اساتذہ، اکاؤنٹنٹ سب ہی لگتا ہے میرے لباس کے پار دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لگتا ہے یہاں کوئی اپنی بیوی سے خوش نہیں۔ دوسری نہیں تو تیسری ملاقات میں ضرور اپنی ناکام ازدواجی زندگی کا قصہ لے بیٹھتے ہیں۔

'سمیرا یہ تو بہت کوفت کی بات ہے۔'

'ہاں امی کوفت تو ہے۔ پھر یہ کہ جس کا بڑھتا ہاتھ جھٹک دو وہ اسے توہین گردانتا ہے اور اوچھی حرکتوں پر اتر آتا ہے۔' شکر ہے امی میری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

'بیٹی تم اسکول بدل کر دیکھو۔'

'امی میں تین اسکول بدل چکی ہوں۔ اس معاشرے میں مطلقہ کے لیے اکیلے رہنا ممکن نہیں۔ آزادیٔ نسواں ابھی یہاں کی ڈکشن میں نہیں آئی، امی گزارا ہونا مشکل ہے۔' میرے لہجے کی مایوسی امی سے نہ چھپ سکی۔ 'اور امی ساتھی اساتذہ ہی کیا، کچھ بچوں کے تو باپ بھی اکثر چلے آرہے ہوتے ہیں۔ سب کا خیال ہے امریکہ پلٹ مطلقہ ہے۔ ایک زمیندار صاحب جن کا بچہ میری کلاس میں ہے وہ مجھے ڈیفنس میں ایک اپارٹمنٹ میں سیٹ کرانے کی پیشکش بھی کر چکے ہیں' اب میں باقاعدہ رو پڑی۔

'رو نہیں بیٹا، واپس آجاؤ، یہاں ہم سب ہیں۔' امی کی آواز بھی گلوگیر ہوگئی۔

'امی ان لوگوں نے مجھے اپنی نظر میں گرا دیا ہے، کیا میں اتنی آسان، اتنی مہیا، اتنی Frustrated لگتی ہوں؟'

سمیرا نے کوشش کی کہ کسی طرح جم سکے، لیکن جب ہر جگہ ایک ہی سا ماحول دیکھا تو امریکہ واپسی کی ٹھان لی۔ ہیوسٹن جانے کے لیے اب بھی تیار نہ تھی۔ ان تین سالوں میں اطہر کی ریزیڈنسی ختم ہو چکی تھی اور وہ شکاگو جا کر بس گیا تھا۔ سمیرا کے نیویارک میں بہت دوست تھے۔ اسے نیویارک ہر حال میں ایک اچھا انتخاب لگا۔ اپنے پرانے اسکول فون کیا تو انھوں نے اب تک اس کی جگہ کوئی دوسری استانی نہیں رکھی تھی، یوں سمیرا واپس کراچی سے نیویارک آگئی۔ یہاں تابندہ کے علاوہ سمیرا کی بہترین دوستیں حنا اور دیبا سب ہی تو تھے۔

ایک ہی دن آرام کے بعد سمیرا واپس اسکول گئی تو لگا جیسے اپنے گھر آگئی۔ ساتھی اساتذہ

نے کھل کر اس کا استقبال کیا۔

میں نے سب سے پہلے تابندہ کو فون کیا۔ تابندہ اور اس کے شوہر، زین، دونوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور شام مجھے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت دی۔ میری شرط وہی تھی کہ اپنے کتے کو باندھ کے رکھنا۔

'ارے پاگل، کتے سے اچھا ساتھی کوئی نہیں، چاہے زین سے پوچھ لو،' تابندہ شوخی سے بولی۔

'ہاں بھئی مجھ سے زیادہ تو یہ Doggy اس سے قریب ہے' زین بھی ہنس دیا۔'اچھا ہوا تم آ گئیں، میں نے پہلے ہی کہا تھا پاکستان مت جاؤ' تابندہ مجھ پر برس پڑی۔

'چلو بھئی صبح کا بھولا شام کو لوٹ آیا' زین نے بیچ بچاؤ کرایا۔

'ہاں بھئی ایک اور ڈراؤنا خواب ختم ہوا۔ فی الحال تو میں اسکول ہی میں مہمان اساتذہ کے کمرہ میں رہ رہی ہوں، لیکن اپارٹمنٹ ڈھونڈنا ہے۔'

'ارے تو جب تک یہاں چلی آؤ' زین نے خلوص سے کہا۔ اس سے پہلے کہ اس کا جملہ ختم ہوتا، تابندہ نے درمیان میں اچک لیا۔

'ہاں سمیرا ضرور، لیکن اصل میں امی آ رہی ہیں، تمھی کو تکلیف ہوگی۔'

'ارے نہیں بھئی میرا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ تم لوگوں کو تکلیف دوں۔ میں نے شرمندگی سے کہا۔'بس زین بھائی مدد کر دو اپارٹمنٹ دیکھنے میں۔'

'ہاں۔ ہاں یہ کون سا ایسا مسئلہ ہے، میں ضرور تمھاری مدد کر دوں گا' سمیرا کو لگا تابندہ کو یہ بات پسند نہیں آئی۔

دوسرے دن زین اسے کچھ اپارٹمنٹ دکھانے لے گیا۔ بلکہ اس کام کے لیے زین کو دو تین بار سمیرا کو لے کر جانا پڑا۔ سمیرا نے ابھی تک کار نہیں خریدی تھی۔ بس اور ٹیکسی سے کام چل رہا تھا۔

دیبا کو معلوم ہوا کہ سمیرا آ گئی ہے تو اس نے بھی سمیرا کو فون کیا۔ خوب گلے شکوے ہوئے۔ دیبا شام کو ملنے آنے کے لیے تیار تھی۔ سمیرا نے اسے بتایا کی وہ ابھی اسکول کے ہی اک کمرے میں ٹھہری ہوئی ہے۔ دیبا کے شوہر سے ملے بھی بہت دن ہو گے تھے۔ لہٰذا میں

آجاتی ہوں۔

تمھارے گھر، اپنے شوہر سے کہو مجھے اسکول سے لے لیں، ابھی تک میرے پاس کار بھی نہیں۔'

'مسعود تو آج کل بہت دیر سے آرہے ہیں سمیرا۔ چلو تم آ تو گئی ہو، کسی دن ملاقات بھی ہوجائے گی۔' دیبا نے یہ کہہ کر اتنی جلدی فون بند کیا کہ میرے انٹینا ملے جلے پیغامات دینے لگے۔

پھر اس کے بعد یہ معمول بن گیا۔ سمیرا کو رفتہ رفتہ احساس ہونے لگا کہ اس کی دوستوں کے شوہر تو اس کی مدد کے لیے تیار رہتے ہیں، لیکن اس کی دوستیں اسے گھر بلانے سے خائف ہیں۔ حالانکہ کسی دوست کے شوہر نے کبھی کوئی نامناسب بات نہیں کی۔ لیکن اس کی دوستوں کے فون آنا تقریباً بند ہو گئے چہ جائیکہ یہ پوچھنا کہ کوئی ضرورت یا کام تو نہیں۔

سمیرا کی دوست حنا بھی سمیرا کی کشتی میں ہی سوار تھی۔ اس کے شوہر کا بہت نوجوانی ہی میں ایک ٹریفک کے حادثے میں انتقال ہوگیا۔ حنا ایک کاسمیٹکس کمپنی میں ملازم تھی۔ شوہر کی وفات کے بعد ابھی تک دور دور کسی دوسرے مرد کی آمد کی اطلاع نہیں تھی۔ سمیرا کچھ دن کے لیے، حنا کے ساتھ ہی اس کے اپارٹمنٹ میں رہنے لگی۔

'مجھے لگتا ہے میں نے اپنی سہیلیوں کو بہت استعمال کیا ہے' میں نے پاؤں صوفے پر سمیٹتے ہوئے وہ موضوع چھیڑا جو مجھے بہت تنگ کر رہا تھا۔

'کیوں بھئی، ایسا کیا کام لے لیا تم نے ان سے' حنا ٹی وی کے ریموٹ سے چینل بدل رہی تھی۔ شام کا وقت تھا، ہم دونوں چائے کے ساتھ ٹی وی کے سامنے براجمان تھے۔

'پتہ نہیں، انھوں نے مجھے اپنی انجمن سے بالکل کاٹ دیا ہے۔ مجھے لگتا ہے بعض تو میری اپنے گھر آمد و رفت پسند نہیں کرتیں' میں اصل موضوع پر آ گئی۔

'ہوں' حنا کا ہنکارہ معنی خیز تھا۔

'ہوں کیا، مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم میں نے کیا کیا ہے' میں نے اس سے مشورہ مانگا۔

'تم نے یہ کیا ہے کہ تم مطلقہ ہوگئی ہو۔'

'مطلقہ ہوگئی ہوں تو کیا۔ میں نے کسی سے مالی مدد نہیں مانگی۔ پھر سب دوستوں کو پتہ ہے

میں نے کتنی کوشش کی تھی اپنی شادی بچانے کی لیکن تعلقات ایسے نہیں رہے تھے کہ شادی بچ سکتی۔' میں نے اپنا دفاع کیا۔

'بات بار بننے کی نہیں ہے، تمھیں ابھی طلاق کو ایک سال سے بھی کم ہوا ہے، اور وہ بھی پہلے چار چھ ماہ تم نے پاکستان میں جھک ماری۔ میں چار سال پہلے بیوہ ہونے کے بعد اس عذاب سے گزر چکی ہوں۔ ہماری طرف کی سب خواتین ہم سے خوف زدہ رہتی ہیں کہ کہیں ہم ان کے شوہر پر ڈورے نہ ڈال دیں۔ اس لیے وہ اپنے گھر میں ہمارا داخلہ پسند نہیں کرتیں۔'

'واقعی؟ یہ میری قریبی سہیلیاں جو میری بہنوں کی طرح ہیں، سمجھتی ہیں کہ میں ان کا شوہر چھین لوں گی' میرے لہجے میں دکھ، کرب، شکست اور زمانے بھر کی حیرت تھی۔

'مطلقہ یا بیوہ عورت کا عذاب اب مغرب و مشرق دونوں میں ایک جیسا ہے۔ وہاں یہ کہ ہر آدمی تر نوالہ سمجھتا ہے یہاں یہ کہ ان کی بیویاں ڈکیت سمجھتی ہیں۔'

'ایسا کیسے ہو سکتا ہے حنا، تمھیں غلط فہمی تو نہیں ہوئی، تو ہم کہاں جائیں۔'

'کہیں نہیں، بہت پھونک پھونک کر، بہت احتیاط سے اسی معاشرے میں اپنی جنگ جیتیں۔ ہر قدم، ہر جملے، ہر سانس سے پہلے یہ شعوری جانچ کریں کہ اس کا کوئی غلط مطلب تو نہیں نکل سکتا۔' حنا بھی اداس ہو گئی۔

'میں نہیں مان سکتی، تابندہ میری بچپن کی دوست ہے؟'

دوسرے دن میں نے سوچا تابندہ سے براہِ راست بات کروں۔ آخر پچھلے اٹھائیس سال سے دانت کاٹے کی دوستی ہے۔ تابندہ کیسے اس پر شبہ کر سکتی ہے۔ بغیر بتائے میں تابندہ کے گھر جا پہنچی۔ جوش اور جذبے میں کتے کا خیال بھی نہیں آیا۔ اتفاق سے دروازہ کھلا ملا۔ میں اندر داخل ہوئی تو تابندہ کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔

'دیبا ذرا احتیاط سے۔ میں نے تو سمیرا کو بالکل کاٹ دیا ہے۔ تم بھی زیادہ اسے گھر میں نہ گھساؤ۔'

'ہاں یہ صحیح ہے' دوسری طرف سے غالباً یہی کہا گیا ہوگا جبھی تو تابندہ بولی:

'زیادہ تر اس کے اپارٹمنٹ جا کر مل لیا کرو۔ دیبا دیکھو اگر مزاج اچھا ہوتا تو طلاق کیوں

ہوتی۔ ہمیں تو وہی پتہ ہے ناں جو ثمیرا نے بتایا۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ مجھے تو اطہر بھائی اچھے خاصے معقول آدمی لگتے تھے۔ نہیں بھئی میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ بچپن کی دوستی اپنی جگہ، خطرے سے دور رہو اور اس کا سد باب کرو۔ بلی سے کہوں دودھ کی رکھوالی کرے۔' تابندہ نے ہنس کر فون پر کہا۔

میں اس سے زیادہ نہ سن سکی۔ الٹے پاؤں واپس باہر نکل آئی۔

جب اطہر نے طلاق دی تھی تو بہت تکلیف ہوئی تھی۔ مگر وہ پھر بھی اجنبی تھا، معاملہ نہ نبھ سکا۔ مگر آج بہت ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی۔ آج جب اپنوں نے طلاق دی تو اپنی ذات بہت برہنہ، تنہا اور چھوٹی لگی۔

اس ٹوٹے دل کے ساتھ میں ٹیکسی کرنا بھی بھول گئی اور پیدل ہی گھر کی جانب گھسٹتی رہی۔ راستے میں ایک جانوروں کا شیلٹر نظر آیا تو قدم خود بخود اس کی جانب چل پڑے۔

'سنیں میں کوئی کتا پالنا چاہتی ہوں۔' مجھے اپنی آواز خود بھی اجنبی لگی۔

طائرِ لاہوتی

جھگیوں کی یہ بستی، شہر کی جنوبی حد پر بسی ہوئی تھی۔ پھوڑا بالکل آنکھ کے سامنے ہو تو بہت تنگ کرتا ہے، درستگی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اِدھر اُدھر کسی کونے کھدرے میں ہو تو نظر انداز کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ بستی بھانت بھانت کے کاری گروں، گداگروں، تماشہ دکھانے والوں اور کہیں کہیں جانوروں سے بھری تھی۔ شہر کے اطراف کی یہ بستیاں عموماً غیر اہم، گندی اور پر تعفن ہوتی ہیں۔ لیکن وسطِ شہر پر گرفت ایسی کہ یہ غائب ہوجائیں تو متوسط اور بالائے متوسط گھرانوں میں کھانا پکنا بند ہوجائے، بیت الخلا صاف نہ ہوں، گلی کوچوں سے کوڑا نہ اٹھے۔ غرض ہماری صاف ستھری زندگی پر ایک بریک لگ جائے۔ اسی بستی کی ایک جھگی میں رمضان اپنے تین بندروں کے ساتھ رہتا تھا۔ نام کا اثر کچھ ایسا ہوا کہ ساری زندگی بھوک میں گزری۔ نام تو بدل کے رجو ہوگیا لیکن بھوک نہ بدلی۔

شہر پھیلتا جارہا تھا لیکن کچھ ایسی چالاکی سے کہ جھگیوں کی یہ بستیاں شہر کے بیرونی دائرے میں ہی رہیں۔ قدرت کا آرکیٹکچر ہوتا تو پھیلاؤ سے جلد ہی یہ بستیاں شہر کے اندر آجاتیں، لیکن انسانی ذہن کے آگے قدرت کی سائنس بھی مار کھا جاتی ہے۔ اس پھیلاؤ سے نقصان یہ ہوا کہ رجو کو اپنے تینوں بندروں کی رسی تھامے اب شہر کے وسط میں پہنچنے کے لیے اور

زیادہ فاصلہ طے کرنا پڑتا۔ سواری کا سوال ہی نہ تھا۔ یہاں پیٹ بھرنے کو روپیہ نہ تھا، سواری کا کرایہ کہاں سے ادا کرتا۔ وہ تو بھلا ہو کچرا گاڑی کے ڈرائیور کا کہ شہر میں کچھ اندر تک چھوڑ دیتا، وہاں سے رجو میلوں پیدل سفر کرتا۔ ایک ہاتھ میں ڈگڈگی، دوسرے سے تین رسیاں تھامے۔ رسیوں کے دوسرے سرے پر وہ تین جانور بندھے تھے جن کی حرکتیں تماش بینوں کی دلچسپی و تحیر کا باعث بنتیں اور رجو کے پیٹ کی آگ بجھانے کے اسباب مہیا کرتیں۔ رجو اور بندروں میں ایک ایسا تعلق پیدا ہوگیا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کی بقا و غذا کے لیے لازم وملزوم تھے۔ رجو کی اپنی ضروریات بہت محدود تھیں۔ جسم پر بغیر بنیان کا ایک کرتا جس کی دونوں جیبوں میں الم غلم نہ جانے کیا کیا بھرا رہتا جنھیں وہ تماشہ دکھانے میں استعمال کرتا۔ نیچے کبھی دھوتی اور کبھی شلوار۔ ایک عدد دو بادیوں کی چپل۔ کبھی کوڑے میں ایک جیسے دو جوتے مل گئے تو کچھ عرصے بغیر موزے کے یہ جوتے ساتھ دے جاتے۔ لیکن سب سے دلچسپ اس کی وہ زنبیل تھی جو ہمیشہ پیٹھ پر دھری رہتی۔ زنبیل میں ایسے پیشہ ورانہ خزانے بھرے تھے کہ ایک لمحے کو تو عمرو عیار بھی چکرا جائیں۔ بندر کے لیے ایک ہیٹ، کسی انگریزی اسکول کی سرخ الاسٹک والی ٹائی، ایک چھوٹا سا اسٹول اور کیلا۔ یہ تین چار چیزیں تو گویا خزانے کا مستقل حصہ تھیں۔ اس کے علاوہ راستہ چلتے جہاں کہیں رجو کو ایسی کوئی چیز نظر آجاتی، جسے اس کا ذہنِ رسا کسی کہانی کے سیٹ پر دیکھ پاتا تو وہ بھی زنبیل میں آجاتی۔ کچھ عرصے تماشے کا حصہ بننے کے بعد وہ واپس کوڑے کا حصے بن جاتی یوں ہر ماہ دو ماہ زنبیل کا فرنیچر بدلتا رہتا۔ یہ سلسلے رجو کو مصروف رکھتے اور دائرہ انسانیت کے کسی بیرونی قطر میں اسے زندہ رکھتے، ورنہ جس کے چوبیس گھنٹے تین بندروں کے ساتھ گزریں اس کا خود بندر نہ بن جانا حیرت سے کیا کم ہے؟ جھگی میں بھی ایک چارپائی، چادر، تکیہ، چند برتن، آئینہ، کنگھا، ہڈیوں سے بنا منجن، لوٹا اور ایک ٹین کا بکس کہ جس میں اس کا سارا گھر سما جائے، یہ تھی رجو کی کل کائنات۔ اشیاء کی قلت سے یہ فائدہ ضرور تھا کہ رجو بہت متحرک ہوگیا تھا۔ جب کبھی دس پندرہ سال کے بعد سرکار کو انگڑائی آتی اور بستی کو شہر کے اس کونے سے اس کونے منتقل کیا جاتا، تو سارا سامان ایک بکسے میں ڈال رجو ایک گھنٹے میں ہجرت کے لیے تیار ہو جاتا۔ رجو کو اچھی طرح یاد ہے جب ایک بنگلے میں تماشہ دکھانے گیا تھا تو چوکیدار نے بتایا صاحب لوگ ملک

سے باہر جارہے ہیں اس کی الوداعی پارٹی ہے۔ گیراج میں رکھے مختلف پیائشوں کے چالیس بڑے جہازی قسم کے ڈبے، سوٹ کیس اور کنٹینرز دیکھ کے رجو دنگ رہ گیا تھا۔ یہ پھیلاؤ رجو کی پروازِ فکر سے بلند تھا۔ یہ ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ اوپر کہیں جب رجو اور بنگلے کا مالک ملیں گے تو دونوں ایک ہی جتنے صاحبِ حیثیت ہوں گے، بلکہ جائیداد کا رقبہ بھی ایک ہی ناپ کا ہوگا۔

رجو کو کوڑا گاڑی نے سہراب گوٹھ کے نزدیک اتار دیا۔ اس نے زنبیل پیٹھ پر جمائی، تینوں بندروں کی رسی تھامی اور چل پڑا۔ سہراب گوٹھ سے نزدیک ایک مضافاتی بستی گلشنِ اقبال نام کی تھی۔ مضافات تو خیر برسوں پہلے کی بات ہے اب تو یہ گلشن بھی آدمیوں کا جنگل تھا۔ یہ بات رجو کے حق میں تھی۔ جتنا زیادہ گنجان علاقہ اتنے ہی زیادہ تماش بین۔ پھر بھلا ہو ڈارون کا، شک کا ایسا بیج بو گیا ہے کہ جانوروں بالخصوص بندروں سے ہماری دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس میں رنگ و نسل بھی آڑے نہیں آتی۔ نہ تماشہ دیکھنے والوں کی نہ دکھانے والوں کی۔ بندر چاہے سفید ہو یا گندمی، پیلا ہو یا کالا، جب تک ڈگڈگی پر ناچ رہا ہے، تماش بینوں کی تفریحِ طبع کا باعث ہے۔ لیکن اس میں جتنا قصور ان کم ذہن جانوروں کا ہے اس سے زیادہ لائقِ تحسین وہ ہاتھ ہے جو ڈگڈگی بجا رہا ہے۔ اس کا کنٹرول، اس کے اشارے، کس وقت ڈھیل دینی ہے، کس وقت کھینچ مارنی ہے۔ آپ کسی کو ایسے نچانے کی کوشش کر کے دیکھئے، امکانِ غالب ہے کہ غرا کر کاٹ کھائے گا۔ تو اس کھیل کی کامیابی میں ناچنے اور نچانے والے دونوں کا اپنا اپنا کردار ہے، اور دونوں برابر کی داد و تحسین کے مستحق ہیں۔

رجو اب گلشنِ اقبال کی بڑی چورنگی تک پہنچ گیا تھا۔ تینوں بندروں کی رسیاں چھوٹی کر لی تھیں کہ ادھر ادھر منہ نہ ماریں۔ جس ذائقہ کی عادت پڑ چکی ہو اس سے بہتر سے آشنائی ہوگئی تو ہاتھ سے نہ نکل جائیں۔ ڈگڈگی کی آواز سے لوگ آہستہ آہستہ جمع ہونا شروع ہوگئے، رجو کے گرد ایک حلقہ سا بنتا گیا۔ اچنبھے کی بات یہ ہے کہ ڈگڈگی دن بھر میں کسی وقت بھی بجے، بہت سے لوگ اتنی فراغت سے بیٹھے مل جائیں گے کہ حلقہ بنا کر تماشہ دیکھ سکیں۔ رجو نے اپنا روزانہ کا الاپ شروع کر دیا:

'ہٹ کے صاحبان، دو دو قدم ہٹ کے۔ ارے بھائی جانور ہے آپ کمال کرتے ہو۔

نہ نہ بچے اس کو کیلا نہ دو۔ دیکھو، دیکھو بچے کاٹ کھائے گا پیچھے ہو جاؤ۔'

ساتھ ساتھ ڈگڈگی بھی بج رہی ہے۔ زنبیل اب زمین پر دھری ہے اور اس میں سے تیزی سے چیزیں برآمد ہو رہی ہیں۔ وقت نے رجو کو سکھا دیا تھا کہ پہلے دس منٹ بہت اہم ہیں۔اس میں یا تو وہ مجمع کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا، ورنہ اگر دس منٹ سے ذرا تاخیر ہو جائے تو تجسس مجمعے کا رخ کسی اور عجوبے کی طرف پھیر دیتا۔ آج بھی پہلے دس منٹ کے اندر اندر رجو نے ایک بندر کے سر پر ٹوپی جمائی، دوسرے کے گلے میں ٹائی لٹکا دی اور بندریا کے جسم پر ایک چھوٹی سی چولی باندھ دی۔ یوں اس نے صدیوں پرانے تکون سے ایک فارمولہ ڈرامہ ترتیب دیا۔ بندریا اس کی رسی کے اشارے پر ناچتی، جبکہ دونوں بندر بہ ظاہر خوخیا کے اس کے لیے لڑ پڑتے۔ مجمع کے لیے بندروں کا یہ رویہ بہت دلچسپ اور تحیر خیز تھا۔ خوب سیٹیاں اور تالیاں بجیں۔ انسان اس رویے اور کہانی سے خوب واقف تھے۔ بندروں کو اس نقالی پر خوب داد ملی اور رجو کچھ روپیہ کمانے میں کامیاب رہا۔انعام میں بندر ایک تو رجو کی پھنکار سے محروم رہے اور دوسرے چند کیلوں کے بھی حقدار بنے۔ بندریا اور ہیٹ والا بندر زیادہ سدھے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ جبکہ تیسرا بندر ذرا مزاج دار تھا۔ اس کے کٹکھنے پن کو تماش بینوں نے خوب پسند کیا کہ اس سے کہانی میں ذرا گرمی آ گئی تھی۔مکمل تابع داری تماشائیوں کے مزاج کے خلاف تھی، کوئی بھگت سنگھ نکل آئے تو اسے قبولیت ضرور ملتی ہے۔ یہ تو رجو کو ہی پتہ تھا کہ اس کا کٹکھنا پن کہانی کا حصہ نہیں ہے، اتنے سالوں کے بعد بھی کمبخت کا مزاج تابعداری پر آمادہ نہ تھا۔ یہ فرق خمیر میں تھا یا کھلانے والے ہاتھ سے کیلے کا ذائقہ کڑوا محسوس ہوتا تھا، یہ سوچنے کے لیے رجو کے پاس نہ وقت تھا نہ دماغ۔ یہ بندر رجو کو ناکوں چنے چبواتا، لیکن اسے آپ نچانے والے کی مہارت ہی تو کہیں گے کہ اپنے مزاج دار بندر کے خوخیانے کو بھی ایسے استعمال کرتا کہ وہ مفاد کا ذریعہ بنے۔

رات ڈھلنے سے پہلے رجو واپس بستی پہنچ گیا۔ یہ کھیل روشنی کے ہیں، جب تک تماش بین نہ ہوں تماشہ دکھانے والے کو مزا نہیں آتا۔جھگی میں کچھ دیر کے لیے رجو نے بندروں کو کھلا چھوڑ دیا۔ رات سونے سے پہلے وہ انھیں ایک کھونٹے سے باندھ دیتا۔بھئی کیسے ہی مطیع کیوں

نہ ہوں، ہیں تو آخر بندر۔ ادھر نچانے والے کی آنکھ جھپکی کیا معلوم کیا کر بیٹھیں۔ شروع میں تو رجو اپنے بندر رات بھر کے لیے کھلے چھوڑ دیتا تھا۔ سدھائے ہوئے بندر زیادہ توڑ پھوڑ نہیں مچاتے، لیکن اس کے اعتبار کو اس وقت ٹھیس پہنچی جب ایک بندر بھاگ نکلا۔ اور ستم یہ کہ جنگل تک پہنچنے سے پیشتر ہی ایک ٹرک کے نیچے آ کر مارا گیا۔ رجو اپنے باقی بندر اس کی کچلی لاش دکھانے لے گیا تھا۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا، باقی بندر ایسے سہمے کہ پھر رجو کو مشکل نہ ہوئی۔ دل ہی دل میں اپنی چالاکی پر خوب ہنسا۔ یہ تیسرا بندر ابھی رجو کے پاس نیا تھا۔ اگر چند برس کی رفاقت کو آپ نیا کہہ سکیں۔ مائل بہ سدھائی تھا لیکن ابھی اطاعت کے اس کمال کو نہیں پہنچا تھا جو مطیع بندروں کا خاصہ ہے، عموماً بندر اتنی دیر نہیں لگاتے تھے لیکن بھئی سب بندر ایک سے نہیں ہوتے۔

اس رات تیسرا بندر رسی کھول کے بھاگ نکلا۔ رجو کی حماقت کہ روزانہ بندر کے سامنے ہی رسی میں گرہ لگاتا۔ بندروں کو نقالی سکھا کر پیٹ پالنے والا یہاں چوک گیا۔ یہ خیال نہیں آیا کہ جہاں بندر دوسری حرکتوں کی نقل اتارنا سیکھ سکتے ہیں وہاں یہ گرہ لگانا اور کھولنا بھی سیکھ سکتے ہیں۔ اس میں صرف رجو کو دوش دینا ہی ٹھیک نہیں ہے اکثر ڈگڈگی بجانے والے یہ غلطی کر بیٹھتے ہیں اور گاہے گاہے اپنے مطیع و فرماں بردار جانور سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

بندر نے رسی کیا کھولی اس کے جسم میں گویا بجلی بھر گئی۔ اس نے دوسرے بندر اور بندریا کی رسیاں بھی کھولیں مگر وہ لدھڑ ہی بنے رہے، ٹس سے مس نہ ہوئے۔ کہیں رجو نے بندروں کو اقبال کی شاعری سنا رکھی ہوتی تو ضرور بھاگ نکلتے۔ تن آسانی آزادی پر حاوی ہوگئی۔ تیسرے بندر نے ان دونوں پر زیادہ وقت ضائع نہیں کیا اور چھلانگیں مار، یہ جا وہ جا۔ جھگیوں کے نزدیک نزدیک ہونے سے فائدہ یہ ہوا کہ چھتوں چھتوں کودتا پھلانگتا بستی کے نکڑ تک پہنچ گیا۔ گردن اٹھا کے دیکھا تو ہر طرف آبادی کے آثار تھے۔ صرف ایک سمت میں پہاڑ اور کچھ درخت تھے۔ بندر کی طبیعت اب انسانوں سے اوبھ چکی تھی پھر دودھ کا جلا چھاچھ کیا منہ لگاتا، اپنے ہم جنسوں کی بو نے اسے کشاں کشاں پہاڑ کی سمت کھینچ لیا۔ ابھی پوری طرح بستی سے دور نہیں ہوا تھا۔ منہ سے خوشی کی کلکاریاں اور خوخیانے کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ایک چوکیدار نے جو ایک بندر کو اس طرح چھلانگیں مارتے دیکھا تو اس کے پیچھے دوڑا۔ جب رفتار میں مقابلہ نہ کر سکا تو ایک

ڈھیلہ اٹھا کر مارا جو بھاگتے بندر کے کولہے پر لگا۔ بندر کو فوراً اپنی حماقت کا احساس ہوا اور قبل از آزادی اس جشن کو ترک کر کے اپنی رفتار تیز کر دی۔ میل دو میل بھاگ کر بندر تھک گیا۔ اب خطرے کو پیچھے چھوڑ آیا تھا، مگر اتنی دور پیدل چلنے کا عادی نہیں تھا۔ بندر کی رفتار اور پہنچ اتنی دور ہی تھی جتنی اس کے مالک کی۔ اس سے زیادہ یا کم ہوتی تو رسی کا تناؤ اسے واپس محکومیت کی رفتار پر لے آتا اور وہ نچانے والے کی رفتار پر چل پڑتا۔ اب جو خود اپنی رفتار ملی تو تھک گیا۔ اپنے وسائل اور فاصلوں میں توازن پیدا کرنا بندر کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ پہاڑ ابھی دور تھا اور جنگل اس سے بھی کچھ پرے۔ ایک ٹیلے کے پیچھے ہی سو گیا۔

سورج کی کرنوں نے دماغ کے بند دریچوں کو روشن کیا تو ایک لمحے کے لیے بوکھلا سا گیا۔ نئی جگہ، چاروں طرف میدان، نہ جھگی نہ بندریا۔ اوسان بحال ہوئے تو اپنی آزادی یاد آئی۔ دل بلیوں اچھلنے لگا۔ لیکن ایک نئی حقیقت منہ پھاڑے کھڑے تھی اور وہ تھی بھوک۔ رات کی بھاگ دوڑ نے بھوک خوب چمکا دی تھی۔ یہاں دور دور تک کسی ایسی شے کا امکان نہیں تھا جسے پیٹ کی آگ بھرنے کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ بغیر کسی انتظام کے موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔ یوں آزادی تو مل گئی تھی مگر اب وہ خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ بندر نے ہمت جمع کی اور پہاڑ کا رخ کیا۔ سورج کی تپش ابھی اتنی نہیں بڑھی تھی کہ ناگوار محسوس ہو۔ لمبی لمبی چھلانگیں مارتا بندر تیزی سے پہاڑ کی طرف بھاگنے لگا۔ پہاڑ کے دامن تک پہنچتے پہنچتے اب ہمت واقعی جواب دے رہی تھی۔ جیسے جیسے پہاڑ قریب آ رہا تھا، ہم جنسوں کی بو اس کے نتھنوں میں تیز ہو رہی تھی۔ پہاڑ کے نزدیک سے ہی جنگل کی شروعات تھی۔ پہاڑ کے دامن میں اسے جڑی بوٹیاں اور کچھ پھل ملنا شروع ہو گئے یوں کم از کم بھوک کا فوری اور جان لیوا مسئلہ تو حل ہوا۔ پیٹ بھرا تو آزادی زیادہ مزہ دینے لگی۔ کچھ دیر پہلے خالی پیٹ اس کا ذہن محکومیت کے فائدے گننے لگا تھا۔ بھوک سے نجات ملی تو بندر نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ چھلانگ مار کر نسبتاً اونچی جگہ پر پہنچنے میں بہت لطف آ رہا تھا۔ اب اسے تقریباً نصف بلندی پر بندروں کا ایک گروہ نظر آ رہا تھا۔ غاروں اور کھوؤں سے نکل نکل کر بندر جمع ہو رہے تھے۔ اس کا دل مسرت سے لبریز ہو گیا۔ لیکن پچھلے چند سالوں میں بندر عموماً سیدھی زمین پر چلنے کا عادی ہو گیا تھا۔ اب جو بلندی پر پھلانگنا پڑا

تو جوڑوں میں وہ درد اٹھنے لگے جو اس کے لیے نئے تھے۔ وہ حرکتیں جو غالباً اس کی سرشت میں شامل تھیں غلامی میں رہ کر زنگ کھا چکی تھیں۔ اب بندروں کا گروہ زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ بندر بھی قطار بنا کر اوپر سے اسے ایسے دیکھ رہے تھے کہ جیسے گلشنِ اقبال کے تماش بین۔ ابھی اسی بات پر غور کر رہا تھا کہ ایک پتھر آ کر اس کے کولہے پر لگا۔ اس نے بندروں کے غول کی طرف دیکھا مگر پتھر وہاں سے تو نہیں آ سکتا تھا۔ کیا اس کے تعاقب میں انسان یہاں تک پہنچ گیا۔ مگر دور دور تک کسی انسان کی باس نہیں تھی۔ پھر اس ڈگڈگی والے ہاتھ کی بو سے تو وہ بہت مانوس تھا، میلوں پہلے سے یہ بو اسے ہشیار کر دیتی۔ نہیں یہ کوئی اور ہی دشمن تھا۔ یہ ادھیڑ بن زیادہ دیر نہیں رہی کیوں ایک دوسرا پتھر جو اس کے قریب آ کر گرا یہ بہت صاف تھا کہ بندروں کے گروہ سے ہی آیا تھا۔ ابھی اس سے بچا ہی تھا کہ مزید پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ اب اس کے جسم میں مزید اتنی طاقت نہیں تھی کہ پھرتی سے جگہ بدل بدل کر اپنے آپ کو بچاتا، ایک آدھ پتھر لگ ہی جاتا۔ اسی کش مکش میں پاؤں ایسا رپٹا کہ الٹتے پلٹتے، قلابازیاں کھاتے پہاڑ سے نیچے گرنے لگا۔ وہ تو خیریت ہوئی ایک بڑے پتھر سے ٹکرا کر رک گیا ورنہ نیچے پہنچتے پہنچتے تک ہڈیاں سرمہ ہو جاتیں۔ اب وہ ان پتھروں کی پہنچ سے دور تھا گو کچھ بندر اوپر اونچائی سے نیچے اتر کر اس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ کچھ دیر ستا چکا تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت واپس آئی۔ اب جسم اور اعصاب مضمحل تھے، بھوک بھی دوبارہ چمک اٹھی تھی۔ اس بار وہ جہاں گرا تھا وہ جڑی بوٹیوں سے دور جگہ تھی۔ گھسٹنے لگا، کچھ قدم بڑھتا پھر ستا لیتا۔ جینے کی امنگ کیا انسان کیا جانور ہر جاندار میں خطرے کے وقت اضافی قوت ڈال دیتی ہے۔ گھسٹ گھسٹ کر پھر جڑی بوٹیوں کے نزدیک پہنچ گیا۔ جسمانی قوت گو پھر کسی حد تک بحال ہوگئی لیکن ذہنی کدورت نہ مٹ سکی۔ اب ذہن دو حصوں میں بٹ چکا تھا۔ ایک طرف محکومی کی آسانی تھی، پکا پکایا مہیا تھا۔ دوسری طرف آزادی تھی، خطرات تھے، کھلی فضا تھی۔ ذہن پھر بھی آزادی کی پکار زیادہ سن رہا تھا۔ آزادی کی اتنی قیمت ہوگی یہ اسے اندازہ نہیں تھا۔ کیا آزاد بندر ہی آزاد رہ سکتے ہیں، کیا محکوم بندر اس آزاد گروہ میں شامل ہونے کا حق کھو بیٹھے ہیں؟ ایسا ممکن نہیں ہے کہ میں اپنے ہی ہم جنسوں کے لیے اب قابلِ قبول نہیں ہوں۔ یہ سوچ کر بندر نے کسی دوسرے رخ سے رجوع

کرنے کا فیصلہ کیا، وہ پھر اٹھا اور اس دفعہ پہاڑ ایک نئی سمت سے چڑھنے لگا۔ وائے نادانی کہ اس امر سے بے خبر تھا کہ اگر شرکت اور تقسیم سے بچا جاسکتا ہے تو آزاد منش بھی نئے ممبر قبول نہیں کرتے۔ اس رخ سے بھی پتھر آنے لگے۔ اب یقیناً محکومی کے کیلوں کا ذائقہ یاد آنے لگا۔ تین برس کی محکومی رسیاں تڑانے کی تڑپ کو اتنی ضعیف کر چکی تھی کہ بندر نے آسان راستہ اختیار کیا اور واپس ڈگڈگی بجانے والے کی بستی کی راہ لی۔ جان بچانے کی امنگ نے گویا پیروں میں پھر سے جان ڈال دی۔ گرتا، پڑتا، بھاگتا، اچھلتا پہاڑ سے دور ہوتا گیا۔ بستی میں جلتی بجھتی لالٹینوں کی روشنیاں اب نظر آنے لگی تھیں۔ رجو نہیں رکھے گا تو کسی اور کی غلامی میں چلا جاؤں گا۔ بندر نے حاکم بدلتے دیکھے تھے، غلامی وہی رہتی، صرف حاکموں کے چہرے بدل جاتے۔ تھکا ہارا جسم بستی اور پہاڑ کی درمیانی سڑک عبور کرنے لگا تو آتے ہوئے ٹرک کی زد سے نہ بچ سکا۔ ٹرک کی ہیڈ لائٹس نے اس کے دیدے ایسے روشن کر دیے کہ وہ سمجھ بھی نہ سکا کہ اس کی زندگی کی امنگ ٹرک کی رفتار سے ہار گئی ہے۔ آزادی کا آسان راستہ شاید یہی تھا کہ وہ ایسی گلی میں نکل لیا جو رجو کی دسترس سے دور تھی۔ بندر غلامی سے آزادی کی طرف بھاگتے ہوئے مرا یا آزادی کے سوئمبر میں ناکامی سے واپسی پر مارا گیا، یہ بات رجو کبھی نہ جان سکا۔ بندر اور بندریا کو یہ لاش دکھانا بہت ضروری ہے، اس کے ذہن کے کسی کاروباری خلیے نے نکتہ اٹھایا۔

نظم و نثر کے نئے انداز

دنیا زاد

کتابی سلسلہ

سال میں تین کتابیں

خصوصی اشاعتیں

عاشق من الفلسطین

سیاسی سماجی تجزیہ اور نظم و نثر کا انتخاب

دنیا دنیا دہشت ہے

تجربے سے تجزیے تک

میں بغداد ہوں

موجودہ صورت حال کا ادبی تناظر

بی ۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی

ای میل: info@scheherzade.com

دنیائے افسانہ

آخری افسانے
ابوالفضل صدیقی

دفینہ
ابوالفضل صدیقی

خاک کا رُتبہ
حسن منظر

پسِ نوشت
قیصر تمکین

تفریح کی دوپہر
خالد جاوید

دستک
محمد عاصم بٹ

سودا
جیتندر بلو

میرے دن گزر رہے ہیں
آصف فرخی